فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۵

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جنوری ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۵ء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۱۵

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جنوری ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۵ء

.....ختم.....

جلد ۱۱۵ — عدد ۱

ماہ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۵ء

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آہ شاہ صاحب!

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین اور اڈیٹر معارف جو شاہ صاحب کے نام سے یہاں یاد کئے جاتے تھے اب اپنے پاک دل، پاک ذات اور پاک صفات کے ساتھ آغوش رحمت الٰہی میں ہیں ——— ۱۳؍ دسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کے روز اپنے تمام روزمرہ کے معمولات میں مشغول رہے، دس بجے دن کو بال بنوایا، غسل کیا، کھانا کھایا، جمعہ کی نماز پڑھی، ڈھائی بجے تک عاجز راقم سے ملاقات رہی، اخبار پڑھتے پڑھتے سو گئے، گہری نیند سوئے، چار بجے اٹھے، اپنے ایک دیرینہ ہم جلیس مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے، عصر کی نماز کے لئے وضو کا پانی منگوایا، کرسی سے اٹھ کر وضو کے لئے اٹھنا چاہتے تھے کہ زمین پر گر گئے، خیال ہوا کہ بیہوش ہو گئے ہیں، ان کے دوست ڈاکٹر عبد الحفیظ انصاری بلائے گئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، وہ نہ بیمار پڑے نہ سکرات کی تکلیف ہوئی، نہ کسی کو کچھ خدمت کرنے کا موقع دیا، ایسا معلوم ہوا کہ زمین پر سے یکایک اٹھا لئے گئے اور دار المصنفین کے در و دیوار کو اداس نہیں، بلکہ روتا چھوڑ گئے، ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت ان کے وطن ردولی دار المصنفین کے کارکنوں اور ان کے قدر دانوں کے جلو میں لیجائی گئی، جہاں وہ چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک کئے گئے، اللّٰھم اغفر

و الرحمہ و ادخلہ الجنۃ

ان کی رحلت دار المصنفین کے لئے حقیقی معنوں میں جانکاہ حادثہ ہے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے دار المصنفین کو چھوڑا تو مولانا مسعود علی ندوی کا انتظامی سلیقہ، مولانا عبد السلام ندوی کی علمی شہرت اور اس ادارہ سے خود جناب شاہ صاحب کی شیفتگی برابر کار رہی، عاجز راقم کو بھی اس کی خدمت میں گیارہ سال گذر چکے تھے، استاذی المحترم جناب سید صاحب خوش تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی زندگی کے بعد کے دار المصنفین کا نقشہ دیکھ لیا، ان کے بعد اس علمی تاج محل پر چودھویں چاند کی چاندنی تو نہیں چھٹکی، مگر یہ برقرار رہا، ۱۹۵۶ء میں مولانا عبد السلام ندوی داغ مفارقت دے گئے، تو ایک بڑا خلا پیدا ہوا جو پُر تو نہ ہو سکا، لیکن دار المصنفین کی علمی سرگرمیاں بدستور باقی رہیں، ۱۹۵۲ء میں مولانا مسعود علی ندوی کی صحت خراب ہوئی تو ۱۹۶۶ء تک ان کی علالت کا سلسلہ جاری رہا، اپنے انتظامی امور کا بار اس راقم کے دوش ناتواں پر ڈالا، وہ بھی خوش رہے کہ انھوں نے بھی اپنی زندگی کے بعد کا نقشہ، دار المصنفین دیکھ لیا، مگر شاہ صاحب کی وفات سے دار المصنفین ایک زبردست آزمائش میں مبتلا ہے، وہ دار المصنفین کی دو نسلوں کی جلا کے ترشے ہوئے ہیرے بن گئے تھے، اور اس کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے تھے اب یہ نگینہ نکل گیا ہے، تو انگوٹھی بے رونق ہو رہی ہے، ان کی جگہ کو پر کرنے والا اب کوئی نہیں، دار المصنفین اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے، موت العالِم موت العالَم،

———— ٥ ————

وہ پچاس سال پہلے ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہو کر دار المصنفین آئے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو قلم پکڑنا سکھایا، پھر تو مضمون نگار بنے، شعر و ادب کے ادا شناس

بھی، صحابہ کرامؓ کے سوانح نگار بھی، مورخِ اسلام بھی، دین رحمت کے شارح بھی، معارف کے اڈیٹر بھی، اور جو کرسی علامہ شبلیؒ نے حضرت سید صاحب کو عطا کی تھی اس پر ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے بٹھائے گئے تو شبلی و سلیمان کی علمی روح و روایت کو برقرار رکھنے میں اپنی ساری علمی و ادبی صلاحیتیں صرف کیں،

حضرت سید صاحب ان کے ادب و انشا کے معترف رہے، انھوں نے دارالمصنفین کے سلسلہ صحابہؓ کی تین جلدیں لکھیں جو اچھی زبان کی وجہ سے بہت پڑھی گئیں، وہ اردو شعر و ادب کے کسی پہلو پر کچھ لکھ دیتے تو یہ اس صنف کا قابل قدر اضافہ سمجھا جاتا، ان کے مضامین "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی و جغرافی اثرات" اور "اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی حیثیت" سے بڑی ادبی و تحقیقی رہنمائی ہوئی، جگر، اصغر، حسرت، اور اقبال پر جو ناقدانہ مضامین لکھے، وہ ادبی حلقے میں بہت پسند کئے گئے، ان کے ادبی مقالات کے مجموعہ نقوش ادب کو اردو کے تنقیدی ادب میں اہم جگہ حاصل رہے گی، تاریخ اسلام پہلے بھی بہت لکھی گئی، مگر ان کی چار جلدیں اپنے موثر اور دل نشین انداز کی وجہ سے اس برصغیر میں بہت مقبول ہوئیں، یہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات میں سیرۃ النبیؐ کے بعد ان ہی کی مانگ بہت زیادہ ہے، اسلام اور عربی تمدن ایک عربی کتاب سے ترجمہ ہے، مگر محض ان کے اسلوب کی وجہ سے اصل سے کم نہیں، دین رحمت میں اسلام کی رواداری اور فراخدلی کو کچھ ایسے دلکش پیرایہ میں پیش کیا کہ اس کے ہندی ترجمے کی اجازت کئی جگہ سے مانگی گئی، آخر میں انھوں نے حیات سلیمان کی تکمیل برسوں کی محنت کے بعد کی، اس کی اشاعت پر ہر طرف

سے داد و تحسین ملی اور حیات شبلی ہی کے پایہ کی تصنیف قرار دی گئی، معارف میں ان کے کچھ مضامین ابھی چند مہینے پہلے مسائل حاضرہ پر شائع ہوئے، جو اس قدر پسند کئے گئے کہ ان کے ترجمے عربی زبان میں بھی کئے گئے،

شبلی کا ایجاز، سلیمان کا وقار، پھر ان کی انفرادی سلاست، روانی، شگفتگی اور برجستگی ان کے اسلوب کا امتیازی رنگ ہو گیا تھا، وہ اپنی تحریروں کی بے ساختگی میں عالمانہ رنگ اور عالمانہ رنگ میں وزن اور وزن میں نکھار پیدا کرتے رہے، اپنی تصنیف و تالیف میں دبستان شبلی کے انداز بیان اور مسلک کا پورا لحاظ رکھتے، اسی کی نگرانی رفقائے دارالمصنفین کی تحریروں پر بھی رکھتے، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کو بھی ان کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی پر بڑا بھروسہ تھا، مولانا کی مشہور اور مقبول کتاب اقبال کامل کو جامع اور دلنشین بنانے میں ان کا بڑا حصہ رہا، میری تحریروں میں بڑی بے تکلفی سے ترمیم کر دیتے، جس کو غور سے پڑھ کر میں خوش ہو جاتا، ان کو اپنی ہر تحریر کو دکھانے میں لذت ملتی، اگر پسند کر لیتے تو اسی کو اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتا، پھر فکر نہ ہوتی، کہ کوئی اور کیا رائے رکھے گا،

معارف کے معیار کو برقرار رکھنے میں اپنی دوسری تصنیفی سرگرمیاں قربان کیں، وہ اس کے ہر مضمون کی نوک پلک کو شروع سے آخر تک درست کرتے، بعض اوقات پورے مضمون کو از سر نو لکھ دیتے، حک و اصلاح اور حشو و زوائد کو دور کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی، معارف میں ان کے شذرات شوق سے پڑھے جاتے، حضرت سید صاحب نے ان کو پڑھ کر داد دی، کہ اب س اور م میں کوئی فرق نہیں رہا، ملک کے اخبارات و رسائل میں

برابر نقل ہوتے رہتے، کبھی ان کے لکھنے میں ان کا لب ولہجہ تیز و تند ہو جاتا، مگر ان کے شگفتہ
انداز بیان کی وجہ سے تلخی پیدا نہیں ہونے پاتی، بلکہ ان کی سخت رائے مخلصانہ اور تعمیری
سمجھی جاتی، اہم شذرات کے چھپنے سے پہلے مجھ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا، اس کے تیز لب و لہجہ
سے اختلاف کرتا تو وہ اپنی شرافت اخلاق سے اس میں ترمیم کر دیتے، مگر خفا ہو کر کہتے کہ میری
مصلحت اندیشی سے ان کا قلم رکتا ہے، اور کبھی ترمیم کرنے پر یہ کہہ کر راضی نہ ہوتے کہ
بعض اوقات تیز اور بے لاگ تحریر بھی مفید پڑ جاتی ہے، اور ضرور مفید پڑتی رہی،

آٹھویں صدی ہجری میں صابریہ چشتیہ سلسلہ میں شیخ احمد عبد الحقؒ بہت ہی برگزیدہ
بزرگ گذرے ہیں، ردولی ضلع بارہ بنکی میں ان کا مزار اقدس اب بھی مرجع عوام و خواص
ہے، شاہ صاحب انہی کے خاندان سے تھے، شکل وجیہ، چہرہ باوقار، اور داڑھی منور پائی
تھی، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علی گڈھ میں ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ
میں مولانا سید سلیمان کو تو نہیں دیکھ رہا ہوں، وہ جس مجلس میں شریک ہوتے محبت
وعزت کی نظروں سے دیکھے جاتے، بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، مگر اپنی پاکیزگی میں خشکی
نہیں آنے دی، طبیعت کی شگفتگی برابر باقی رکھی، جب ۳۵ سال کے رہے ہونگے، تو
دوسری بیوی سے بھی دائمی جدائی ہوگئی، ۷۰ سال کی عمر پائی، مگر بقیہ زندگی تجرد میں
گذار دی، دار المصنفین ہی کو عروس بنا کر اس سے ہمکنار رہے، معاملات کی صفائی کا بڑا خیال
رکھتے، کسی کا حق اپنے ذمہ باقی نہیں رہنے دیتے، نجی زندگی میں تکلیف اٹھا کر ضرورت مندوں
کی مالی امداد کرتے رہتے، دار المصنفین کے ایک برآمدہ اور دو کمرے کی چھوٹی سی عمارت میں
پوری زندگی بسر کر دی، کہتے کہ اس میں جو راحت ملتی ہے وہ اپنے گھر میں بھی محسوس نہیں

ہوتی، نماز باجماعت کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے، تہجد گذار بھی تھے، مناجات مقبول اور کلام پاک
کی تلاوت روزانہ کرتے، موت سے سینہ سپر ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہے، حج کا شرف دوبار
حاصل کیا، آخری بار گذشتہ سال حجاز کے شاہ فیصل کی طرف سے زیارت خانہ کعبہ کے لئے مدعو کئے
گئے، مرکزی حکومت ہند نے ان کے علم و فضل کا اعتراف عربی میں سند اور خلعت عطا کر کے
کیا، اس سلسلہ میں ان کو تین ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا، مگر تین سال سے زیادہ نہ پا سکے، ساری
عمر دار المصنفین سے جو قلیل تنخواہ ملتی اسی پر قانع رہ کر بسر کی، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ ملیہ
دہلی سے ان کو خاطر خواہ تنخواہ پر مدعو کیا گیا، لیکن دار المصنفین کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا اصل
مقصد قرار دیا، سفر کرنے سے بہت گھبراتے، ملک کے مختلف حصوں سے صدارت اور بالمعاوضہ
مقالہ خوانی کی دعوت آتی رہی، مگر ان کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، آخر عمر میں مولانا
زکریا سہارنپوری سے بیعت ہو گئے تھے، تو اوراد و وظائف میں بھی مشغول رہنے لگے تھے،
گذشتہ نومبر میں ان کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوئے تھے، وہاں سے واپسی پر اپنے وطن
ردولی میں انفلوئنزا میں مبتلا ہو گئے تھے، صحت یاب ہو کر دار المصنفین واپس آئے تو چھٹے روز
اپنے قدر دانوں کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، موت ان کے پاس ضرور آئی
مگر دبے پاؤں آئی منھ چھپائے ہوئے آئی اور ان کے بربط ہستی کے سرود سے محفل ہم آغوش ہونے آئی"

راقم دار المصنفین ان کے یہاں آنے کے گیارہ سال بعد آیا، مگر ہم دونوں چالیس
سال تک لازم ملزوم، ایک جان دو قالب بلکہ عرض و جوہر بن کر رہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو
کہ کون لازم ہے، کون ملزوم، کون جان ہے اور کون قالب، امیر خسرو کا ایک بہت ہی
مشہور شعر ہے، جس میں انھوں نے من و تو اور جان و تن کی تفریق مٹا کر من دیگرم تو دیگری کا

سوال ہی ختم کر دیا ہے، ہم دونوں دارالمصنفین کی زندگی میں اسی طرح رہے، انھوں نے اپنے
کو میرے لئے اور میں نے اپنے کو ان کے لئے مٹایا، ان کے غصے پر مجھ کو پیار آتا اور میرے پیار پر
ان کو غصہ آتا، ان کو کبھی زیادہ جھلاہٹ آجاتی تو تھوڑی دیر کے بعد ہی معذرت کرتے جس
میں اظہار ندامت کے بجائے غیر معمولی محبت ہوتی، اسی کو میں اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتا رہا،
وہ دارالمصنفین کے ناظم ضرور تھے، مگر نظامت کے سارے فرائض میرے ذمہ کر رکھا تھا، وہ
خوش رہتے کہ میرے کام میں کوئی دخل نہیں دیتے، مگر میری خوشی اس کوشش میں رہتی کہ
کوئی کام ان کے مزاج کے خلاف نہ ہو، ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور میری علمی سرگرمی
وہ کوک دیدیتے تو میں گھڑی کے پرزوں کی طرح متحرک رہتا، وہ دارالمصنفین سے کچھ
دنوں کے لئے باہر چلے جاتے تو مجھکو محسوس ہوتا کہ وہ میری ساری علمی قوت اپنے ساتھ ہمیشہ
کر لیتے گئے ہیں، وہ گھر جاتے تو میرے لئے بے قرار رہتے، ان کی چہیتی لڑکی ان سے کہتی کہ
وہ اپنے ساتھ اپنی روح کو بھی کیوں نہیں لاتے، مجلس انتظامیہ کے بعض ارکان کہتے کہ
ہم دونوں مل کر ایک آدمی بنتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر بے جان
ہو جاتے ہیں، چالیس برس تک ہم دونوں کی یہی مثالی زندگی رہی، وہ اس دنیا سے خوش
گئے ہوں گے کہ مجھ سے ان کو شکایت نہیں ہوئی، اور مجھ کو فخر ہے کہ میری ذات سے انکو
آخر وقت تک کوئی تکلیف نہیں پہونچی، مگر اب ان کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں اپنی
زبان حال سے کہتا ہونگا، ع

نہ دماغ ہے، نہ فراغ ہے، نہ شکیب ہے، نہ قرار ہے

وہ میرے لئے سب کچھ تھے، افسر اعلیٰ، محترم بزرگ، عزیز بھائی، مشیر، رفیق کار

ہمدم و ہمساز، دوست اور کیا نہیں، اب وہ نہیں رہے، تو میں اپنے کو کچھ بھی نہیں پاتا،

فریاد کہ غم دارم و غم خوار ندارم

اقبال کا خیال تھا کہ سوگواری کی ظلمات میں مرنے والوں کی یادوں کی جبین اسی طرح
چمکتی رہتی ہے، جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کب تک
میری آنکھیں دیکھتی رہیں گی کہ وہ آرہے ہیں، جا رہے ہیں، خدا جانے کب تک میرے کان
سنتے رہیں گے کہ وہ پکار رہے ہیں، الجھ رہے ہیں، الجھ کر میری باتوں کو مان رہے ہیں، انکی ذات سے میرے لئے دارالمصنفین کی
ہر صبح حسین اور ہر شام رنگین تھی، مگر اب ان کے بعد اس کی خاموش فضا بڑی غمگین
اور اس کی سونی رات کی تاریکی انتہائی اندوہگیں ہو گئی ہے، اس کے احاطہ میں شام
آتی ہے تو میرا دل مفلس کا چراغ بن کر بجھا بجھا سا رہتا ہے، استاذ محترم حضرت سید صاحب
نے لکھنا پڑھنا تو سکھایا تھا، ماتم کرنا نہ سکھا سکے تھے، کیسے لکھوں کہ آہ! بزم شبلی کی قندیل
کی آخری شمع بجھ گئی، سلیمان کی امانت کا بار اٹھانے والا آسمان پر اٹھا لیا گیا، دارالمصنفین
کی متانت اور وقار کو سینے سے لگائے رکھنے والا سپرد خاک کر دیا گیا، اور اپنے ایک ہمراز،
ہم مشرب اور ہم پیالہ کی تنہائی اور بے چارگی پر دارالمصنفین کے پھول پتے، شجر اور حجر کو
رونے کے لئے چھوڑ گئے، حالی نے اپنے استاد غالب کی وفات کے بعد بزم سلطانی، تخت
خاقانی، راح ریحانی، عقل ربانی، اور حسن کنعانی کو فانی پاکر ہستی کو محض سراب اور طلسم خیال
پایا تھا، اب سے پہلے حالی کے ان جذبات کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا، مگر اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کیفیات حقیقت
بھی بن جاتی ہیں، کاش میں تھوڑی دیر کیلئے بھی متمم بن نویرہ بن جاتا تو جس طرح وہ اپنے بھائی کی موت
پر مرثیہ لکھ کر خود رویا، اور گلی گلی گھوم کر دوسروں کو رلایا، اسی طرح میں بھی یہ درد نوحہ لکھکر روتا اور لوگوں کو رلاتا

خوں شد دل خسرو نہ گفتم اشتیاق را چوں ہیچ کس محرم اسرار ندارم

دار المصنفین کے مستقبل کی شب تاریک اور بیم موج و گرداب سے گھبرا اٹھا تو اضطرابی کیفیت میں دو تین روز لکھنؤ جاکر مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ساتھ رہا، صحبت اولیاء اللہ میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ انکی مجلس میں پائی، ان کی حوصلہ افزائی سے بڑا سہارا ملا، ان کے ساتھ مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا حافظ عمران خاں ندوی نے دار المصنفین کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں باہمی مشورے کئے، وہاں سے ردولی آیا، مرحوم کی لڑکی اور ان کے اعزہ کو دیکھ کر پھر غم امنڈ پڑا، ان کی قبر دیکھی نہ جاسکی، حضرت شیخ عبد الحقؒ کی لحد مبارک پر حاضری دی، فاتحہ پڑھتے وقت سکون قلب کی دعا مانگی، اس وقت وہاں کے سجادہ نشین جناب شاہ آفاق احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے مجھکو دیکھتے ہی کہا:

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے صبر آتے آتے آئیگا

یہ سن کر پھر غم تازہ ہوگیا، مگر انھوں نے یہ شعر بھی سنایا،

گیتی گر کسے پایندہ بودے ابو القاسم محمدؐ زندہ بودے

اس مشہور شعر سے سوزش دل پر تسکین کے کچھ چھینٹے پڑے،

انھوں نے علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ سے زیادہ عمر پائی، مگر اسوقت دار المصنفین کو انکی سربراہی اور رہنمائی کی شدید ضرورت اتنی ہی تھی جتنی کہ ایک محاذ پر ایک جوان سپہ سالار کی ہوتی ہے، اسلئے انکی اچانک رحلت جوانمرگی سے کم المناک نہیں، دار المصنفین اپنے سوز سینہ کے داغ سے بے چین اور درد و غم سے فگار ہو کر فلک سے کہہ رہا ہے کہ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتے کوئی دن اور، مگر مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی کا دامن تھام کر اسی کی بارگاہ میں اب صرف یہی دعا کرنا ہے کہ وہ اپنی خدا ترسی، دینداری، نیک نفسی، فرض شناسی اور اوصاف کی پاکیزگی کی بدولت کوثر کی موجوں اور تسنیم کی لہروں سے سیراب ہو رہے ہوں، آمین ثم آمین۔ الوداع اے شبلی کے علمی لشکر کے آخری رجز خواں! الوداع اے سلیمان کے کارناموں کے حدی خواں! الوداع اے جان جانان دار المصنفین السلام! شبلی کی روح کیطرف سے سلام، سلیمان کی مسند علم کی طرف سے سلام، کارکنان دار المصنفین کی طرف سے سلام اور ایک مجبور، مغموم، محزون، خستہ دل اور شکستہ خاطر رفیق کار کی طرف سے بھی سلام، ہزاروں سلام، لاکھوں سلام

مقالات

دیار پورب کا دوسرا علمی دور.

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی،

(۳)

عہد ابراہیمی میں باہر سے آنے والے فضلاء میں قاضی نظام الدین (شہاب الدین) احمد بن محمد گیلانی متوفی ۸۵۰ھ نمایان شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے گجرات میں تحصیل علم کی تھی، سلطان ابراہیم شاہ کی علم پروری، اور علماء نوازی کا شہرہ سنکر جونپور آئے، اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ان کے علم و فضل کی بنا پر ان کو سلطان کے مقربین میں شامل کرلیا اور وہ پہلے جونپور کے قاضی بنائے گئے، پھر مچھلی شہر گے، جہاں ان کی اولاد بہت پھولی پھلی، اور ان میں علماء و مشائخ پیدا ہوئے، قاضی نظام الدین گیلانی نے سلطان ابراہیم کے حکم سے فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" تالیف کی،[1]

مفتی محمد بن ابو البقا کرمانی جونپوری متوفی ۸۸۰ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور جونپور آکر شیخ ابو الفتح بن عبد الحئی کندی سے تعلیم حاصل کی، دیار جونپور میں ان کے فتاویٰ بہت مقبول و مشہور ہوئے، سلطان ابراہیم ان کے علم و فضل کا بڑا معتقد تھا، اور مسائل شرعیہ میں ان سے

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۴۱ ۔

رجوع کرتا تھا، ایک مرتبہ سلطان نے ایک باغی اور سرکش راجہ کی تادیب کے لیے فوج روانہ کی، اس جنگ میں ایسے لوگ بھی مارے گئے جو باغی اور سرکش نہیں تھے، سلطان کو یہ چیز جہاد کے خلاف معلوم ہوتی تھی، اس نے مفتی صاحب سے استفتاء کیا، انھوں نے جواب دیا کہ ان سے قتال جائز ہے، اگرچہ وہ فی الحال باغی و متمرد نہیں تھے، مگر وہ اعداء اسلام ہیں، اور موقع کی تلاش میں رہا کرتے ہیں۔[1]

مولانا عادل الملک بن عبد الملک جونپوری اس دور کے مشہور علماء و مشائخ میں تھے، پنڈوہ (بنگال) جاکر شیخ علاء الدین پنڈوی سے طریقت حاصل کی، اور جونپور واپس آکر کچھ دنوں مقیم رہے، سلطان ابراہیم ان کا بھی معتقد تھا، اور انکی ذات کو بابرکت سمجھتا تھا، سنہ ۸۳۰ھ میں سلطان نے ان کو رائے بریلی میں جاگیر عطا کرکے وہیں آباد کرادیا۔

شیخ خضر بن حسن بلخی حدیث کے بڑے عالم تھے، وہ اپنے وطن بلخ سے ہندوستان آئے، اس وقت سلطان ابراہیم شاہ کی علم نوازی کا عام چرچا تھا، اس لیے دوسرے علماء و فضلاء کی طرح شیخ خضر بھی جونپور چلے آئے، سلطان نے ان کو لکھنؤ میں تدریس کی خدمت پر مامور کرکے ملیح آباد کے اطراف میں کئی گاؤں کی جاگیر عطا کی۔

قاضی رضی الدین ردولوی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے اور شاگرد تھے، سلطان ابراہیم نے ان کو ردولی کا قاضی بنایا، جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی، مشہور عالم و بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ سے سلطان ابراہیم کو بیحد عقیدت تھی، جب وہ جونپور تشریف لائے تو سلطان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ایک مرتبہ جب وہ جونپور کی جامع مسجد میں آئے تو سلطان ابراہیم قاضی شہاب الدین کی معیت

لے نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۳۳،

میں حاضر خدمت ہوا، اس وقت سلطانی فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، واپسی پر سید صاحب نے سلطان کو اپنی مسند عنایت فرمائی اور فتح کی بشارت دی، اس کے تیسرے دن قلعۂ چنار کی فتح کی خبر آگئی، اسی لیے سلطان نے دوبارہ حاضر خدمت ہوکر نذر پیش کی مگر سید صاحب نے قبول نہیں فرمایا، کئی شاہزادے حلقۂ ارادت میں شامل ہوکر قیام جونپور کیلیے مصر ہوئے، سید صاحب نے ان کی دلجوئی میں فرمایا کہ ہم جونپور میں اگرچہ نہیں رہیں گے مگر سلطان کی حدود سے باہر نہیں جائیں گے، اور جونپور میں دو ماہ سے زیادہ مقیم رہے۔[1]

اسی دور میں سید عثمان شیرازی درویش دہلی ہوتے ہوئے وارد جونپور ہوئے، اور سلطان اور ارکانِ دولت ان کے ساتھ بھی عزت و احترام سے پیش آئے، ملک خالص مخلص اور دوسرے امرا نے ان کے لیے محلہ دریبہ میں ایک سنگین مسجد بنوائی جس میں شیخ محمد بن عیسیٰ تاج بھی نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے، یہ مسجد اب بھی موجود ہے، اور اسی کے قریب شیخ عثمان کا مزار ہے۔[2]

افضل العلماء ملا بہرام متوفی ۸۲۹ھ مرتاض جہاں، حافظ قرآن نجیب الطرفین اور حاجی الحرمین الشریفین تھے، دہلی میں اکتساب علم و فضل کرکے شاہزادہ ظفر کے ساتھ ظفرآباد آئے، اور وہاں کی جامع مسجد کے امام و خطیب بنائے گئے، جس علاقے میں سکونت اختیار کی، اس کو منطق ٹولہ کہتے تھے، (تجلی نور ج ۲ ص ۲۱)

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود شاہ شرقی (۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ) نے بیس سال سے زاید مدت تک حکومت کی، وہ بھی عادل و منصف ہونے کے ساتھ ساتھ محب العلم والعلماء تھا، اس نے بھی اپنے دور سلطنت میں بہت سے علمی و دینی آثار قائم کئے، اور باپ کی طرح علم پروری اور علما نوازی میں شہرت پائی، شیخ محمد بن عیسیٰ ابراہیمی دور کے علمائے کبار اور

لے لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶　　لے تجلی نور ج ۱ ص ۲۵،

مشائخِ عظام میں تھے، ان کے لیے سلطان محمود شاہ نے انکی خانقاہ کے قریب جامع مسجد (جامع الشرق
بڑی مسجد) تعمیر کی جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ کے دور میں ہوئی۔

مخدوم سید علی بن داؤد علمائے جونپور میں علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور رموز صوری
و معنوی سے واقف تھے، سلطان محمود شاہ اور اس کی ملکہ بی بی راجی دونوں ان سے کمال عقیدت
و محبت رکھتے تھے، بی بی راجی نے ان کے لیے شہر سے باہر ایک عالیشان سنگین مسجد بنوائی جو مسجد
لال دروازہ کے نام سے مشہور ہے، اور جامع الشرق کا نمونہ ہے، اسی سے متصل مخدوم سید علی کے لیے
خانقاہ بنوائی اور ان کے نام پر ایک گاؤں علی پور آباد کیا۔[1] یہ مسجد نہایت خستہ حال میں تھی مگر
چند سال سے اس میں مدرسہ حسینیہ کے قائم ہونے سے مسجد آباد ہوگئی ہے۔

سلطان محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ صرف چند ماہ حکومت کر سکا۔

اس کے بعد سلطان محمود شاہ کا دوسرا بیٹا سلطان حسین شاہ تخت پر بیٹھا (۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ)
اور اس پر شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، اس نے بھی اپنے انیس سالہ دور حکومت میں قدردانی علم
و علماء میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی،

اس دور میں قاضی سماء الدین جونپوری اعلم العلماء تھے، ان کو قاضی شہاب الدین
دولت آبادی سے تلمذ حاصل تھا، سلطان حسین شاہ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا،
اس لیے اپنے دور میں ان کو وزیر بنا کر قتلغ خان کا لقب دیا تھا، جس وقت سلطان حسین
سلطان بہلول لودھی بادشاہ دہلی کے مقابلہ میں گیا، قاضی سماء الدین اس کے ساتھ تھے، شکست
کے بعد بہلول لودھی نے ان کو گرفتار کر کے دہلی میں قید کیا، جہاں ۸۹۵ھ تک زندہ رہے،[2]

مخدوم دانیال خضری متوفی ۸۹۳ھ، راجہ حامد شاہ مانکپوری کے مرید و خلیفہ تھے،

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۴۱ [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۸۱،

صاحب مرآۃ الاسرار کے بیان کے مطابق وہ سلطان حسین شاہ کے دور میں جونپور تشریف لائے
اور انتقال کے بعد اپنے حجرہ کے صحن میں جو سلطان محمود شاہ کے حوض خاص کے پشتہ کے پیچھے تھا،
دفن کیے گئے، کہتے ہیں کہ ایک ماہ تک ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔[1]

سلطان ابراہیم، سلطان محمود اور سلطان حسین تینوں حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج متوفی
۸۷۰ھ کے معتقد تھے، ایک دن وہ اپنے حجرہ کی گل کاری کر رہے تھے، کہ سلطان حسین حاضر خدمت
ہوا، شیخ نے ہاتھ دھو کر مصافحہ و معانقہ کرنا چاہا، مگر سلطان حسین نے اسی حال میں مصافحہ
و معانقہ کی خواہش کی، آپ نے اس کی خواہش پوری کر دی، سلطان کے کپڑے میں مٹی لگ گئی،
اس کی یہ عقیدت تھی کہ اس نے وصیت کی کہ اس کو اسی کپڑے کا کفن دیا جائے، سلطان اسکی
بڑی خدمت کرنا چاہتا تھا، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ سلطان نے ان کے صاحبزادے
شیخ حبیب اللہ سے درخواست کی کہ آپ اپنے والد محترم اور ان کے متعلقین، اور خانقاہ کے
واردین و صادرین کے اخراجات کے لیے کچھ جاگیر قبول کر لیں، شیخ محمد بن عیسیٰ نے سنا تو سلطان
کی خاطر سے خاموش رہے، مگر جب سرکاری کارپرداز غلہ اور خطیر رقم لے کر حاضر خدمت ہوئے تو
ان کے دل میں الجھن پیدا ہوگئی، اور فرمایا کہ حبیب اللہ اس غلہ کو کھانے کے بعد خاک کھانے لگا،
کہتے ہیں کہ اسی سال شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوا۔

سلطان بہلول لودھی نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد جونپور کی تسخیر کا قصد کیا،
سلطان حسین کو معلوم ہوا تو اس نے شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو مطلع فرمایا،
آپ نے فرمایا کہ "قاصد محروم و مقہور است" اس کے بعد بہلول لودھی کی جونپور کی طرف
پیش قدمی سے پہلے ہی خود سلطان حسین اس سے جنگ کے لیے نکلا مگر قنوج میں پہلی شکست کھا کر

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۵۰

جونپور واپس آیا، اور شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت مین حاضر ہو کر رنج والم کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا بات وہی ہوئی۔ اگر بہلول جنگ کا ارادہ کرتا تو وہ محروم ہوتا، تم نے یہ کام کیا تو وہ بات تم پر پوری ہوئی، آخر میں جب سلطان حسین لودھیون کے مقابلہ میں شکست کھا کر بہار مین پناہ گزین ہوا تو شیخ محمد رالدین کی خدمت مین حاضر ہو کر دعا اور مدد کی درخواست کی، انھون نے جواب دیا کہ "انداختۂ خواجہ محمد عیسیٰ را مانمی توانیم برداشت" یعنی شیخ محمد بن عیسیٰ کے ٹھکرائے ہوئے کو ہم نہین اٹھا سکتے ہیں،[1]

شیخ بہاء الدین جونپوری کے علم وفضل اور سلطان حسین کے جود وسخا سے دین ودنیا دونوں بہم نظر آتے تھے، سلطان نے ان کے لیے عظیم الشان خانقاہ بنوائی جس میں شاہانہ طرز کے ایوان تھے، چند مواضع جاگیر میں بھی دیئے، جس سے شیخ بہاء الدین کی خانقاہ مرجع فقراء اور مجمع طلبہ بن گئی اور اطمینان وسکون سے تعلیم وتعلم اور ارشاد وتلقین کا کام ہوتا رہا،[2]

مولانا الہ داد جونپوری نے سلطان حسین کی خواہش پر فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ اور اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول بزدوی کے حواشی تحریر فرمائے، اور دونوں کے خطبہ میں سلطان حسین کا نام تحریر کیا، سلطان نے اس کے صلہ مین مولانا الہ داد کو شاہی خزانہ سے ایک لاکھ روپیہ نقد نذر کیا جسے مولانا نے چند دنوں میں حاجت مندون مین تقسیم کرا دیا۔ اس سے طالب علمون کی حالت اتنی سدھر گئی کہ ان مین اور شاہزادون مین کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔[3]

مولانا صفی جونپوری سلطان حسین شاہ کے دور کے مشہور علماء وفضلاء مین سے تھے، انھون نے بہلول لودھی، اور سکندر لودھی کا زمانہ بھی پایا ہے، ان کی تصانیف مین شرح کافیہ

[1] تجلی نور، ج ۱، ص ۲۲ تا ۲۴ [2] تذکرۃ العلماء، ص ۲۵ [3] ایضاً ص ۲۵،

بہت مشہور ہے جسے انھون نے سلطان حسین کے ایک شاہزادے کے لیے لکھا تھا، اور سلطان نے اس کے صلہ مین آپ کو خلعت شاہی سے نوازا تھا، جس وقت سلطان حسین شاہ بہلول لودھی سے جنگ کے ارادہ سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ مولانا صفی اس کے ساتھ تھے، اتفاق سے اثنائے جنگ میں بہلول لودھی کی افغانی فوج نے ان کو گرفتار کر لیا، جب وہ سلطان بہلول کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے ان کے ساتھ بڑی تعظیم وتکریم اور لطف ومدارات کا معاملہ کیا، اور اپنے ساتھ رکھا۔ شہزادہ سکندر بن بہلول لودھی نے ان کی خدمت میں رہکر تحصیل علم کی، جب سلطان سکندر لودھی، سلطان حسین کے مقابلہ مین فتح یاب ہوا تو جونپور کے شاہی قصور ومحلات کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سلاطین شرقیہ کی تعمیر کردہ مسجدون کو بھی ویران کرنا چاہا، مگر مولانا صفی نے جو اس کے ہمرکاب تھے، اس سے باز رکھا، اس پر آشوب دور مین جونپور کے جو علماء وفضلاء اور مشائخ ومدرسین قتل وغارت کی مصیبت مین مبتلا تھے، آخر مین مولانا صفی کی وساطت سے سلطان سکندر لودھی کے دربار میں باریاب ہوئے، سلطان نے ان سب کا مال واسباب واپس کرا دیا، اور ہر ایک کو حسب حال نوازش خسروانہ سے نوازا، اور جونپور کا نظم ونسق درست کر کے اپنے بیٹے جلال خان کو وہان کا حاکم مقرر کیا، اور دہلی کی راہ لی مولانا صفی بھی انہی کے ساتھ واپس ہوئے مگر راستہ میں آگرہ پہونچ کر ان کا انتقال ہو گیا۔[1]

اس دور کے چند مشاہیر ارباب علم وفضل

اوپر صرف اُن چند علماء وفضلاء اور مشائخ کا تذکرہ کیا گیا، جو سلاطین شرقیہ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، ان کے علاوہ شرقی قلمرو مین ہزارون اہل کمال موجود تھے، جو اپنے اپنے حلقون میں دین ودیانت اور علم وفن کی خدمت مین مصروف تھے، ذیل کے حضرات اپنی اپنی ذات سے پوری انجمن تھے،

[1] تذکرۃ العلماء ص ۲۹

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، خواجہ صدر جہان، شیخ اجمل بن امجد بہرائچی،
قاضی تاج الدین ناصحی اودھی ظفرآبادی، قاضی سماء الدین جونپوری، قاضی سناء الدین مچھلی
شہری، قاضی نظام الدین بن صدر الدین زینبی غزنوی مچھلی شہری، قاضی شہاب الدین اودھی،
قاضی محمد بن محمود نصیر آبادی، قاضی محمود بن علاء الدین نصیر آبادی، شیخ فتح اللہ انصاری اودھی،
مولانا علاء الدین جونپوری، مولانا عادل الملک جونپوری، شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری، شیخ صفی الدین
نعمانی ردولوی، شیخ محمد بن قاسم اودھی، شیخ خضر بن حسن بلخی، مولانا عبد الملک جونپوری، سید
اشرف سمنانی کچھوچھوی، شیخ سعد اللہ خیرآبادی، شیخ محمد بن خضر دہلوی جونپوری، قاضی نصیر الدین
گنبذی جونپوری، شیخ محمد بن ظہیر الدین کرڑوی، شیخ محمد بن قطب (شیخ مینا) لکھنوی، شیخ متوکل
کنتوری، شیخ محمود بن حمید کنتوری، شیخ مسعود بن ظہیر فتح پوری، مولانا نور الدین ظفرآبادی، حکیم
شہاب الدین جونپوری، شیخ عبد الرزاق کچھوچھوی، مولانا فخر الدین ردولوی، شیخ فیض اللہ
ابن شیخ حسام الدین مانک پوری، شیخ فیروز بن موسیٰ دہلوی جونپوری، شیخ قاسم بن برہان
الدین چشتی اودھی، شیخ قطب الدین ظفرآبادی، مولانا قیام الدین قریشی ظفرآبادی، مفتی محمد بن
ابو البقا کرمانی لکھنوی، شیخ کمال الدین کرڑوی، شیخ حسام الدین فتح پوری، شیخ حسام الدین
ابن خواجہ خضر مانک پوری، شیخ رکن الدین ہردوی جونپوری، شیخ رکن الدین قریشی ظفرآبادی،
شیخ سارنگ چشتی لکھنوی، شیخ سعد الدین بجنوری لکھنوی، شیخ سعد اللہ لکھنوی، شیخ سعد اللہ
کنتوری، شیخ شمس الدین اودھی، شیخ ابو الفتح بن شیخ عبد الحئی بن شیخ عبد المقتدر شریحی دہلوی
جونپوری، شیخ احمد بن عمر (احمد عبد الحق) ردولوی، شیخ احمد حسینی مانک پوری، شیخ اسمٰعیل بن شیخ
صفی الدین نعمانی ردولوی، شیخ امین الدین لکھنوی، شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری، شیخ بڈھن
علوی بہرائچی، شیخ جلال الدین بن اسمٰعیل مانک پوری، شیخ جمشید ابراہیمی راجگیری اودھی،

شیخ حسام الدین بن نصر اللہ اصفہانی جونپوری، شیخ مشید بن شیخ محمد بن خضر جونپوری، شیخ محمد
قدوائی دریابادی، شیخ مبارک بن حمید بنارسی، شیخ جہان شاہ احمد مانک پوری، مولانا
مولانا خواجہ مانک پوری، مولا عبد الملک جونپوری، مولانا الٰہ داد جونپوری وغیرہ۔

اس دور کی تصانیف

دیار پورب میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ سلاطین شرقیہ کے دور میں
جاری ہوا، جو آج تک قائم و دائم ہے، اور یہ علاقہ ابتک علمائے مصنفین سے معمور ہے،
ہمارے علم و تحقیق میں اس دیار کے مصنفین میں سب سے پہلے عالم مولانا شرف الدین لاہوری
متوفی [illegible] ھ کے بڑے صاحبزادے مولانا امیر صدر الدین ہیں، جو دوسرے شرقی سلطان
مبارک شاہ کے وزیر تھے انکی تصانیف میں سے شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی، اور
حاشیہ تفسیر بیضاوی مصنف تذکرۃ العلماء کی نظر سے گذری تھیں، [1]

ان کے بعد ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے حسب ذیل کتابیں لکھیں، الارشاد،
شرح کافیہ، البحر المواج، شرح اصول بزدوی، شرح قصیدہ بانت سعاد، شرح قصیدہ بردہ،
رسالہ تقسیم علوم، مناقب السادات، ہدایۃ السعداء، بدیع البیان، جامع الصنائع، المصباح،
عقیدۂ شہابیہ، رسالہ معارضہ، فتاویٰ ابراہیم شاہی، رسالہ طہارت زہاد، رسالہ افضلیت عالم برسید
فرشتہ نے قاضی صاحب کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے "تصانیف مستحسنہ آن بزرگوار
شہرت عام دارد" (ج ۲ ص ۳۰۶) اور سبحۃ المرجان میں ہے،

و الّف کتبا سارت بہا	قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں جنکو
رکبان العرب والعجم ص ۳۹	عرب و عجم کے علمی قافلے اپنے ساتھ لے گئے،

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۲،

اہل علم ان کتابوں کو بہترین خط میں لکھکر ایران و توران اور روم و شام کے بادشاہوں کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجتے ان میں سے اکثر سلاطین ان کتابوں کو سونے چاندی سے تول کر اسکو قاضی صاحب کی خدمت میں بطور انعام کے بھیجتے تھے، (تذکرۃ العلماء ص ۱۴)

سلطان ابراہیم کے دور میں کئی علماء نے اس کے نام سے معنون کر کے بلند پایہ کتابیں لکھیں، فرشتہ کا بیان ہے،

"درعصر وے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندان ایران و توران کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند، بدار الامان جونپور آمدہ در ہدامن دامان غنودند، واز خوان احسانِ او ذلہا بر داشتہ بنام نامی او (چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد) چندین کتب ورسائل پرداختند" (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵)

طبقات اکبری میں ہے "وآن دار السلطنت از فر قدوم علماء دار العلم گردید چندین کتب ورسائل بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج و فتاوی ابراہیم شاہی وارشاد وغیر ذالک (طبقات اکبری ص ۵۲۹) قاضی نظام الدین حنفی گیلانی جونپوری نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں فتاوی ابراہیم شاہیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، فقہ حنفی کی یہ کتاب ایک سو ساٹھ کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے، اس کا انداز تحریر فتاوی قاضی خان کا ہے، کشف الظنون میں اس کو "کتاب کبیر من افخر الکتب" لکھا ہے،

سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی شرقی دور کے اجلہ مشائخ و اکابر علماء میں ہیں، انکی تصانیف یہ ہیں، اشرفیہ فی النحو، حاشیہ ہدایہ، الفصول فی اصول الفقہ، شرح عوارف المعارف، شرح فصوص الحکم، قواعد العقائد، اشرف الانساب، بحر الاذکار، فوائد الاشرف، اشرف الفوائد، بشارۃ الذاکرین، تنبیہ الاخوان، حجۃ الذاکرین، فتاوی اشرفیہ، تفسیر نور بخشی،

اوراد اشرفیہ، مرأۃ الحقائق، کنز الدقائق، رسالہ جواز سماع، بشارۃ المریدین، ارشاد الاخوان، رسالہ جواز لعن بریزید، لطائف اشرفیہ ملفوظات جامع نظام الدین غریب یمنی، دیوان اشعار،

مولانا علاء الدین جونپوری، قاضی شہاب الدین کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے اسی شاگرد کے لیے شرح کافیہ لکھی تھی، انھوں نے فراغت کے بعد اپنے استاد کی اس کتاب کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ مولانا علاء الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں،

مولانا عبد الملک جونپوری بچپن ہی سے قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہے اور ان سے جملہ علوم کی تحصیل کی، انھوں نے بھی اپنے استاد کی شرح کافیہ کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھیں۔

شیخ صفی الدین ردولوی قاضی شہاب الدین کے نواسے اور ان کے تلمیذ خاص ہیں، انکی متعدد تصانیف ہیں، علم صرف دستور المبتدی اپنے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل کے لیے لکھی تھی، غایۃ التحقیق کافیہ کی بسیط شرح ہے، اس میں انھوں نے اپنے نانا اور استاد قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی تسہیل کی ہے، کشف الظنون میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مولانا شمس الدین خواجگی کٹروی حدیث و فقہ اور تصوف میں امتیازی شان رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں کتاب المرید و المراد اور کتاب لاربعین ہے، جو مشارق الانوار سے چالیس احادیث کا انتخاب ہے۔

شیخ حسام الدین مانک پوری نے تصوف میں انیس العاشقین لکھی، اور شیخ شہاب الدین مانک پوری نے ان کے ملفوظات رفیق العارفین کے نام سے جمع کیے ہیں، جس میں انکے ۱۲ مکاتیب بھی ہیں

شیخ سعد الدین خیر آبادی فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، ان کی تصانیف میں شرح اصول بزدوی، شرح الحامی، شرح کافیہ شرح مصباح،

اور شرح رسالہ مکیہ ہے، یہ ان کے شیخ شاہ مینا لکھنوی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے،

شیخ محمد بن قاسم چشتی اودھی نے تصوف میں آداب السالکین نہایت مفید کتاب لکھی۔

شیخ کمال کڑوی کالو کے لقب سے مشہور تھے، ان کی کئی تصانیف ہیں ان میں ایک اوراد کالو ہے، شیخ محمد بن ظہیر الدین عباسی کڑوی مدفون لکھنو حاجی الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں، ان کی متعدد کتابیں ہیں جن میں ارشاد المریدین، معیار التصوف، اور اساس الطریقہ مشہور ہیں،

شیخ محمود بن حمید کنتوری نے عربی زبان میں الرسالۃ الحالیۃ فی معرفۃ المداریہ لکھی ہے۔

مولانا الہ داد جونپوری نے سلطان حسین شاہ کی خواہش پر ہدایہ اور اصول بزدوی کی شرح لکھی اور دونوں کے مقدمہ میں سلطان حسین کا ذکر کیا سلطان نے اس کے صلہ میں ان کو نوازا، سلطان حسین خود بھی عالم وفاضل اور موسیقی کا بھی ماہر تھا، اس نے بعض نغموں اور راگوں میں تصرف کرکے دھرپت اور چٹکلہ کے نام سے نئی چیزیں پیدا کیں، اور موسیقی میں تحفۃ الہند کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مولانا صفی جونپوری نے سلطان [illegible] کے شاہزادے کے لئے شرح کافیہ تصنیف کی اور سلطان نے ان کو شاہی خلعت سے نوازا،

نویں صدی میں دیارپورب سلاطین شرقیہ جونپور کی علم پروری اور علما نوازی کی وجہ سے ہر علم وفن کے علما وفضلا اور مشائخ وبزرگان دین کا ملجا وماویٰ تھا، اور قریہ قریہ میں مدارس اور خانقاہیں تھیں جن میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور ارشاد وتلقین کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی حالت میں زمانہ نے کروٹ لی اور جونپور کے سلاطین شرقیہ کا اقبال دہلی کے لودھی سلاطین کے مقابلہ میں ادبار سے بدل گیا، اور اس دیار میں لودھی سلطنت

قائم ہوگئی،

لودھی دور میں علم وعلماء

آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین نے ۸۸۱ھ میں دہلی کی لودھی سلطنت کے مقابلہ میں شکست کھائی اور جونپور کی سلطنت دہلی کی حکومت کے ماتحت آگئی جس میں تین لودھی سلاطین ہوئے ہیں۔

(۱) سلطان بہلول شاہ لودھی از ۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ (۲) سلطان سکندر شاہ ابن بہلول شاہ لودھی از ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ (۳) سلطان ابراہیم شاہ بن سکندر لودھی از ۹۲۳ھ تا ۹۳۲ھ دہلی کے لودھی سلاطین میں دوسرے حکمران سلطان سکندر شاہ لودھی کی وہی حیثیت ہے، جو جونپور کے سلاطین شرقیہ میں سلطان ابراہیم شاہ کی تھی۔ اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر وبرکت کا دور تھا، وہ بڑا عادل ومنصف متقی وپرہیزگار فرمانروا تھا علما وصلحا سے عقیدت رکھتا تھا، ان کو شاہی دسترخوان پر بلاتا، ان کی علمی ودینی مجلسوں میں شریک ہوتا، مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر ان کے درس میں شریک ہوتا، اس نے بہت سی مسجدیں اور سرائیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، سڑکیں اور راستے بنوائے، پیداوار میں اضافہ کیا ہندی کی کتابوں کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے، ظہر کے بعد اور رات میں شاہی محل میں علما سے علمی مذاکرہ کرتا اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتا، اس کے بھائی باربک شاہ نے جب جونپور میں شورش برپا کی تو اس کو فرو کرنے کے لئے خود جونپور آیا، دوسرے لودھی سلاطین بہار اور بنگال کی مہمات کے سلسلہ میں جونپور آتے جاتے تھے، اور یہاں قیام کرتے تھے، انھوں نے ۸۸۱ھ سے ۹۳۲ھ تک پچاس اکاون سال یہاں حکومت کی، اس دور کے اکثر علما وفضلا مخضرم الدولتین ہیں یعنی انھوں نے شرقی سلطنت اور لودھی سلطنت دونوں کا زمانہ پایا ہے، یا پھر لودھی کے بعد تیموری دور دیکھا ہے،

پورب میں لودھیوں کے دور کے کئی آثار پائے جاتے ہیں، جن سے اس دیار سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے، سلطان سکندر لودھی نے اجودھیا میں لچھمن گھاٹ کے پاس ایک بلند ٹیکری پر خام قلعہ تعمیر کر کے دارالامارہ بنایا، اور دریائے سرجو کے کنارے مسجد بنا کر اس میں جمعہ و جماعت قائم کی، اس نے کہیں دیکھا یا سنا تھا کہ حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی قبریں دریا کے کنارے ٹیلہ کے پاس ہیں، اس لیے اس نے یہاں ان کی یادگار قائم کی۔[1] بعض لوگ اسکو حضرت شیثؑ کی قبر سمجھتے ہیں جس کی کوئی اصل نہیں ہے، پرگنہ نتھو پور میں سپاہ کے بارے میں قدیم کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ابراہیم پور ہے، یہاں سے سلطان ابراہیم لودھی کی فوج گذرتی تھی، اور ٹھہری بھی تھی، اس لیے اس کو سپاہ بھی کہتے ہیں، اسی کے قریب لدھوائی گاؤں ہے جو لودھی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس علاقے میں بعض لودھی امراء کی قبریں بھی ہیں، سکندر پور (بلیا) سلطان سکندر لودھی کے نام پر ہے جہاں آج بھی لودھیوں کی یادگار جوہی اور حمسیلی کے کھنڈر کی شکل میں موجود ہے،

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سکندر لودھی نے اپنے دور میں شاہان شرقی کے سارے آثار مٹا دیے تھے، اور ان کی تعمیر کردہ مسجدوں کو بھی ویران کر دینا چاہتا تھا، مگر مولانا صفی جونپوری کی سفارش سے اس ارادہ سے باز رہا، اور اس انقلاب میں جو علماء مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے، ان کو رہائی ملی اور سلطان نے ان سب کی قدر افزائی کی، جس سے علم و فضل کا چمن انقلاب کے خزان سے محفوظ رہا۔

"جونپور کے مشائخ اور مدرس حضرات جو قتل و غارت اور لوٹ مار کی مصیبت میں رہکر خوف و امید کی حالت میں تھے، مولانا صفی کے توسط سے سلطان سکندر لودھی کی خدمت میں

[1] آئینہ اودھ ص ۲۴۱۔

پہونچ سکے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، اور تمام حضرات کے لوٹے ہوئے مال و اسباب واپس کئے گئے، اور ہر ایک حسب حیثیت شاہی عنایت سے بہرہ ور ہوا"[1]

سلطان سکندر لودھی خود بھی محب العلم والعلماء بلکہ خادم العلم والعلماء تھا، اس نے علمائے جونپور کے ساتھ جو نیک سلوک کیا یہ اس کی نیک طینت کا تقاضا بھی تھا، مولانا صفی کے واسطے نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا، لودھی غلبہ و استیلاء کے بحرانی دور میں مولانا موصوف کی ذات نے اس دیار میں علم و علماء پر احسان عظیم کیا، اور بعد میں دیار پورب کے علماء سلاطین لودھی کی عنایت و توجہات کا بھی مرکز بنے ——— چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن لاہرپوری متوفی ۹۲۶ھ جنھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد دہلی کے اساتذہ سے تحصیل و تکمیل کی تھی، فراغت کے بعد بارہ سال تک سلطان سکندر لودھی کے مقربین میں رہے اور اپنی مفوضہ خدمات انجام دیکر پھر جونپور چلے آئے۔[2]

مولانا الہ داد جونپوری آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین کے مقربین میں تھے، انکے صاحبزادے شیخ بھکاری (نام غالباً عبداللہ تھا) لودھی عہد کے علمائے فحول میں تھے ایک مرتبہ سلطان وقت نے دہلی میں مجلس مناظرہ منعقد کرائی جس میں ایک طرف شیخ عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز تلبنی تھے، اور دوسری طرف مولانا الہداد جونپوری اور ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری، فریقین میں سر دربار مناظرہ ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ باپ بیٹے علوم و مسائل کی تنقیح میں مہارت رکھتے ہیں، اور ان کے مدمقابل تقریر میں آگے ہیں۔[3]

شیخ محمد بن منکن مصباح العاشقین ملانوی متوفی ۹۰۳ھ ایک مرتبہ دہلی تشریف لے گئے۔ تو شاہزادہ ابراہیم کو اس کے والد سلطان سکندر لودھی نے ان کا شاندار استقبال

[1] تذکرۃ العلماء ص ۲۲۶ و ص ۲۲۷، [2] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۴۲، [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۳

کرنے کا حکم دیا، چنانچہ شاہزادے نے پرتپاک خیر مقدم کیا، دوسرے دن خود سلطان سکندر لودھی نے شیخ سے نیاز حاصل کرکے شاہی مہمان بنایا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ دیکھکر امراء و اعیان کی ایک جماعت نے بھی بیعت کی،[1]

شیخ محمود بن شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۵ھ (شاہ بھن غازی پوری) ایک مرتبہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے زمانہ غازیپور تشریف لے گیے، اس وقت لودھی سلطنت کی طرف سے نصیر خان لوہانی حاکم غازیپور تھا، وہ ان کے ظاہری و باطنی کمالات دیکھکر ان کا معتقد اور ان کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہوگیا، اور دہلی سے اجازت حاصل کرکے ان کو غازیپور کا میر عدل بنایا، اس عہدہ پر وہ مدت العمر رہے، اور وہیں فوت ہوئے[2]

مولانا حسن بن طاہر جونپوری متوفی ۹۰۹ھ زبردست عالم اور راجہ حامد شاہ مانک پوری کے خلیفہ تھے، سلطان سکندر لودھی نے اپنے دور میں انکو دہلی طلب کیا، مولانا اپنے اہل و عیال کے ساتھ دہلی جاکر محمد تغلق کے قلعہ میں کوشک بیجے منڈل میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔[3]

اسی دور میں مشہور چشتی بزرگ خواجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۱۰ھ کی ذات سے دیار مشرق خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے علماء و مشائخ کا مرکز بنا، ان کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی ۹۲۱ھ نے سکندر لودھی کے دور میں انتقال فرمایا۔

لودھی دور میں بھی دیار پورب میں علماء و مشائخ کی بڑی تعداد تھی جن میں یہ حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری ۸۹۶ھ، سید احمد حسینی مانک پوری ۸۹۹ھ راجہ سید حامد شاہ مانک پوری ۹۱۰ھ، مولانا بہاء الدین عمری جونپوری ۹۱۱ھ، مولانا الہداد حنفی جونپوری ۹۲۳ھ، راجہ سید نور مانک پوری ۹۲۱ھ

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۱۹، [2] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳۳، [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۰،

شیخ حسن بن طاہر جونپوری ۹۰۹ھ، شیخ احمد بن نظام الدین مانک پوری ۹۲۲ھ مولانا خواجگی کرڑوی، ۸۹۰ھ، شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری (شاہ بھن غازی پوری) ۹۰۵ھ شیخ نصیر الدین قلندر سمرقندی جونپوری نگوری ۹۱۵ھ، شیخ قطب الدین بینا دل قلندر ۹۲۵ھ، قاضی احمد بن محمود نصیر آبادی، ۹۳۵ھ، شیخ خاصہ بن خضر امیٹھوی ۹۲۲ھ شیخ داؤد بن قطب بنارسی، ۹۰۶ھ، شیخ عبد الصمد سائن پوری ۹۳۳ھ، مولانا عبد اللہ بن مولانا الہداد جونپوری، (مولانا بھکاری) شیخ فخر الدین بجنوری لکھنوی، ۹۱۰ھ شیخ فرید الدین بنارسی ۹۰۶ھ، وغیرہ وغیرہ،

شرح السنہ امام بغوی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس بحث کے تمام حصوں سے اتفاق نہ ہو، تاہم مصنف کی تحقیقی شان اور انکی وسعت علم و نظر کا اس سے پورا اندازہ ہوتا ہے، اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے ملتی جلتی ایک اور بحث کا خلاصہ بھی نقل کر دیا جائے جو جمع قرآن کے باب میں تحریر کی گئی ہے۔ لیکن اصل بحث سے پہلے اس باب کی متعدد روایتوں میں سے ایک روایت کو ملاحظہ کر لینا چاہیے۔

انا خارجۃ بن زید بن ثابت ان زید بن ثابت قال لما نسخنا الصحف فی المصاحف فقدت آیۃ من سورۃ الاحزاب کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرؤھا لم اجدھا مع احد الا مع خزیمۃ الانصاری الذی جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شھادتہ شھادۃ رجلین

خارجہ بن زید روایت کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا کہ جب ہم لوگ مصاحف میں صحیفے نقل کر رہے تھے تو سورۂ احزاب کی ایک آیت جسے میں نے رسول اللہ کو پڑھتے سنا تھا کھو گئی، سو یہ آیت بجز خزیمہ انصاری کے جن کی تنہا شہادت کو رسول اللہ نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا اور کسی کے یہاں نہیں ملی۔

اس حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ [لم اجدھا مع احد الا مع خزیمۃ الانصاری] تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ قرآن کو ثابت کرنے کے لئے تنہا ایک شخص کی بات کافی ہے، کیونکہ خود حضرت زیدؓ نے بھی یہ آیت سنی تھی، اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین سے اس کے سورۂ احزاب میں ہونے کو بھی جانتے تھے اسی طرح بعض اور صحابہؓ کو بھی اس کا علم تھا، البتہ انھیں یہ آیت بھول گئی تھی اسی لئے جوں ہی اسے سنا وہ انھیں فوراً یاد آ گئی۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چار آدمی قرآن کو جمع کرتے تھے، یہ سب انصاری تھے، اور ان کے نام یہ ہیں ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زیدؓ بن ثابت اور ابو زیدؓ۔ بعض روایتوں میں حضرت ابو درداءؓ کا نام بھی آتا ہے۔ ان حضرات کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شریک رہتے تھے مگر زیادہ شہرت ان ہی لوگوں کو ہوئی۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا چار آدمیوں سے قرآن پڑھو (۱) عبد اللہ ابن مسعودؓ، (۲) حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام سالم (۳) ابی ابن کعبؓ (۴) اور معاذ بن جبل سے۔

جن مشہور قراء کی قرأت کی سندوں کا سلسلہ صحابۂ کرام تک متصل ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں عبد اللہ بن کثیر اور نافع کی سندیں ابی بن کعبؓ سے ہیں، عبد اللہ بن عامر کی حضرت عثمانؓ سے، عاصم کی حضرت علیؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ اور زیدؓ سے اور حمزہ کی حضرت عثمان و علی (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہیں اور ان صحابۂ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن کو پڑھا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن مجید سوائے سورہ برأت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں جمع اور مرتب

اور لوگوں کے سینہ میں محفوظ ہو چکا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے سورہ انفال کے بعد سورہ برأت کو کس طرح ملا دیا، جب کہ اول الذکر مثانی میں اور موخر الذکر مئین میں ہے، اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی تحریر نہیں فرمایا تو انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مختلف وقتوں میں نازل ہوا اور جب آپ پر اس کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کسی کاتب قرآن کو بلا کر ہدایت فرماتے تھے کہ ان آیتوں کو اس سورہ میں شامل کرو جن میں یہ یہ باتیں مذکور ہیں، سورۃ انفال مدنی دور کے ابتدا میں نازل ہوئی تھی۔ اور سورۃ برأت سب سے آخر میں اتری ہے اور ان دونوں کے واقعات اور قصے ملتے جلتے ہیں، لیکن رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا۔ مگر آپ نے اس کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ اسی میں ہے اسی لیے میں نے اس کو ملا دیا ہے مگر ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ موجودہ ترتیب و تالیف رسول اللہؐ کے زمانہ ہی میں ہو چکی تھی، البتہ آپؐ نے اس کو ایک مصحف میں اس لیے جمع نہیں کرایا کہ ممکن ہے۔ اس میں سے کوئی چیز منسوخ ہو جائے اور اس کی تلاوت کا حکم ختم کر دیا جائے، جس طرح کہ بعض احکام منسوخ ہوتے رہتے تھے۔ سو اگر آپؐ نے قرآن کو یکجا کرا دیا ہوتا اور پھر اس کی تلاوت منسوخ ہو جاتی تو اس کے نتیجہ میں اختلاف بھی رونما ہوتا، اور دین کا معاملہ بھی گڈمڈ ہو جاتا۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے زمانۂ نسخ تک اسکو لوگوں کے دلوں میں محفوظ کر دیا اور پھر خلفائے راشدینؓ کو اس کے جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بغیر کسی رد و بدل اور

کمی بیشی کے دفتین کے اندر وہی قرآن جمع کیا ہے، جو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول پر اتارا تھا۔ اور حدیث کی صراحت کے مطابق وہ جمع قرآن کے لیے اس بنا پر آمادہ ہوئے تھے کہ ابتداءً قرآن مجید مختلف ٹکڑوں، کھجور کے پتوں پر اور لوگوں کے سینوں میں منتشر تھا۔ حفاظ کی شہادت کے بعد جب ان کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو انھوں نے رسول اللہؐ کے جانشین سے اس معاملہ میں رجوع کیا اور ان کو اسکے جمع کرنے کے لیے آمادہ کیا، خلیفہ نے سب سے رائے و مشورہ لے کر اس کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان حضرات نے اس کو ٹھیک اسی طرح سے لکھا جس طرح سے انھوں نے رسول اللہؐ سے سنا تھا بغیر اس کے کہ اس میں کسی قسم کی تقدیم یا تاخیر یا اس کی کوئی ایسی ترتیب مقرر کی ہو جسے انھوں نے رسول اللہؐ سے اخذ نہ کیا ہو اور خود رسول اللہؐ کا معمول تھا کہ جب آپؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ اسے اسی ترتیب کے مطابق جو ہمارے موجودہ مصاحف کی ہے صحابہ کو تلقین و تعلیم دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت جبریلؑ آپؐ کو اس سے آگاہ فرماتے تھے، اور ہر آیت کے نزول کے وقت مطلع کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد اس سورہ میں لکھی جائے گی جس میں فلاں بات بیان کی گئی ہے۔ اسی مفہوم کی روایت حضرت عثمانؓ سے کی گئی ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ صحابۂ کرام کی کوششوں کا تعلق قرآن کی ترتیب سے بالکل نہ تھا۔ بلکہ وہ محض اس کو ایک جگہ اکٹھا کر دینے سے متعلق تھیں کیونکہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہے، اور وہ لوح محفوظ میں بھی اسی ترتیب کے موافق ہے جو ہمارے موجودہ مصاحف میں پائی جاتی ہے، اللہ نے ایک ہی دفعہ میں پورا قرآن مجید

رمضان کے مہینہ میں شب قدر کے اندر دنیوی آسمان کی طرف اتارا تھا جیسا کہ فرمایا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ۔ (بقرہ ۷)
رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

اور دوسری جگہ ہے کہ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر ۷-۱)
ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔

پھر وہ متفرق طور پر نجماً نجماً حسب ضرورت رسول اللہؐ پر آپؐ کی زندگی بھر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد ربانی ہے:۔

وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث (اسراء ۱۰۶)
اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تم مہلت کے ساتھ اسے پڑھ کر سناؤ۔

گویا نزول کی ترتیب تلاوت کی ترتیب سے مختلف ہے۔ اور صحابہ کرام کا یہ اتفاق امت میں قرآن کے بقا کا سبب، بندوں پر اللہ کی رحمت اور اس کے قرآن کی حفاظت کے وعدہ کی دراصل تکمیل تھا۔ جیسا کہ فرمایا:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ۔ (حجر ۹)
بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اسکے نگہبان ہیں۔

پھر صحابۂ کرام رسول اللہؐ کے بعد ان حروف پر قرآن کی تلاوت کرتے رہے جن کو آپؐ نے اللہ کے حکم سے انھیں پڑھایا تھا۔ مگر جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قراء کے درمیان اختلاف واقع ہوا اور اس نے نہایت نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کرلی اور مختلف شہروں سے اس کے متعلق حضرت عثمانؓ کے پاس خطوط آنے لگے اور

حذیفہؓ بن یمان نے تو غزوۂ ارمینیہ سے واپسی کے بعد ان سے براہ راست اس پر گفتگو کی تو حضرت عثمانؓ نے مہاجرین وانصار کو جمع کر کے ایک حرف پر مصاحف میں قرآن کو جمع کر دینے کے لیے مشورہ کیا تاکہ اختلاف ختم ہوجائے۔ تمام لوگوں نے ان کی رائے کو پسند کیا، اور اس کو بہت محتاط و مناسب بتایا تب حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے یہاں سے مصحف منگایا، اور زیدؓ بن ثابت اور قبیلہ قریش کے تین آدمیوں (عبداللہؓ بن زبیر، سعیدؓ بن عاص اور عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام) کو اسکے نقل کرنے کا حکم دیا، یہی نقلیں انھوں نے مختلف مقامات اور شہروں کو روانہ کیں،

مصعب بن سعد سے روایت ہے کہ جب قرآن کے بارہ میں لوگوں کے اختلافات بڑھے اور انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ ابن مسعودؓ کی قرات ہے، یہ سالمؓ کی قرات ہے، اور یہ ابیؓ کی قرات ہے تو حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کو جمع کر کے فرمایا کہ میں زیدؓ بن ثابت کے حرف مصاحف لکھوا کر شہروں میں بھجوانا چاہتا ہوں، لوگوں نے کہا آپ کی رائے نہایت خوب ہے، اس پر انھوں نے پوچھا کہ عربیت میں سب سے فائق کون ہے، لوگوں نے بتایا کہ سعیدؓ بن عاص، پوچھا کتابت میں سب سے بڑھ کر کون ہے؟ بتایا گیا کہ زیدؓ بن ثابت جو کاتب وحی ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا تو سعید املا کرائیں اور زید لکھیں، چنانچہ مصاحف لکھے اور شہروں میں بھیجے گئے، اس کے بعد میں نے صحابہ سے یہ کہتے سنا کہ

احسن واللہ عثمان
بخدا عثمانؓ نے بہت عمدہ کیا۔

سوید بن غفلہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کہ لوگو اللہ سے ڈرو، عثمانؓ کے معاملہ میں غلو سے پرہیز کرو اور انھیں حراق المصاحف (مصاحف جلانے والا) کہنا چھوڑ دو۔ خدا کی قسم انھوں نے ہم سب۔ سربرآوردہ صحابیوں کی موجودگی میں مصاحف

جاتے تھے، اور دریافت کیا تھا کہ اس قرأت کے بارے میں جس میں لوگ مختلف الرائے ہیں، آپ لوگ کیا رائے دیتے ہیں، حالت یہ ہوگئی ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے ملتا ہے تو کہتا ہے کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے، تمہاری قرأت تو کفر کے مشابہ ہے۔ ہم لوگوں نے کہا امیر المومنین آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا میں تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ جب آج تم لوگ اس قدر جھگڑ رہے ہو تو تمہارے بعد والے تو اور زیادہ اختلاف کریں گے۔ ہم لوگوں نے کہا آپ کی رائے کتنی عمدہ ہے، چنانچہ انھوں نے زید بن ثابتؓ اور سعید بن عاصؓ کو بلوایا اور کہا کہ ایک آدمی لکھے اور دوسرا املا کرائے، اور جب کسی چیز میں دونوں کا اختلاف ہو تو اسے میرے پاس لاؤ۔ لیکن ان لوگوں میں صرف سورہ بقرہ کے ایک لفظ کے بارہ میں اختلاف ہوا، سعید "تابوت" اور زید "تابوہ" کہتے تھے، جب مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس آیا تو انھوں نے "تابوت" لکھنے کا حکم دیا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ میں ذمہ دار ہوتا تو یقیناً وہی کرتا جو انھوں نے کیا تھا۔

ابو مجلز کا بیان ہے کہ عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو اگر انھوں نے سب کو ایک قرأت پر جمع نہ کیا ہوتا تو لوگ قرآن کو بھی اشعار کی طرح پڑھتے۔

ابو عبد الرحمن سلمی سے روایت ہے کہ ابو بکر، عمر، عثمان، زید بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی قرأت ایک ہی تھی، اور وہی مشہور ومعروف قرأت ہے، اور اسی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے سال دو دفعہ حضرت جبریلؑ کے سامنے دور کیا تھا، حضرت علیؓ بھی زندگی بھر مصحف عثمانی کے مطابق قرأت کرتے رہے، کہا جاتا ہے کہ زید بن ثابتؓ بھی رسول اللہؐ کے آخری دور میں موجود تھے، اور اسی میں منسوخ وغیر

منسوخ کی مکمل تصریح کی گئی تھی، سلمی سے یہ بھی منقول ہے کہ زید بن ثابت نے رسول اللہ کی وفات کے سال دو بار آپ کے سامنے قرآن پڑھا تھا، اور اس قرأت کو زیدؓ بن ثابت کی قرأت کہے جانے کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اسے رسول اللہؐ کے لیے لکھا، اور آپ کے سامنے پڑھا تھا، اور آپ کے آخری دورہ میں وہ موجود بھی تھے، اور اسی کو وہ عمر بھر لوگوں کو پڑھاتے رہے اسی لیے ابو بکرؓ وعمرؓ نے جمع قرآن میں اس پر اعتماد کیا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے بھی مصاحف کی کتابت اسی بنا پر ان کے سپرد کی تھی، (جلد چہارم ص ۵۱۶ تا ۵۲۶)

مشکلات حدیث کی شرح وتوجیہ پہلے گذر چکا ہے کہ شرح السنہ حدیثوں کی شرح وتوجیہ میں بے نظیر کتاب ہے، امام بغوی نے خود اس کو اپنی کتاب کی اہم خصوصیت بتایا ہے، اس لیے ذیل میں اس کے بعض نمونے پیش کیے جاتے ہیں،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا کیا تھا، اس لیے قرآن مجید کی طرح بعض حدیثیں بھی جوامع الکلم میں ہیں، اس طرح کی مختصر اور جامع حدیثوں کا مفہوم امام بغوی نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، مثلاً ایک مشہور حدیث ہے:۔

المسلم من سلم المسلمون	مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے
من لسانه ويده والمهاجر	مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ جو ان باتوں کو
من هجر ما نهى الله عنه	چھوڑ دے جن سے اللہ نے اسے روکا ہے،

امام بغوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ قابل ستائش مسلمان اور مہاجر وہی شخص ہے جس کے اندر یہ اوصاف موجود ہوں لیکن اگر کسی کے اندر یہ اوصاف بدرجۂ اتم نہ ہوں تو اس کے اسلام کی اس سے نفی مقصود نہیں ہے، جیسے کہا جاتا ہے الناس العرب المال الابل

اور مراد افضل شخص اور افضل مال سے ہوتی ہے، اسی طرح افضل مسلمان وہ ہے جو اللہ کی طرح مسلمانوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہو اور ان کی آبروریزی سے باز رہتا ہو اور افضل مہاجر وہ ہے جو وطن کی طرح تمام محرمات اور منہیات کو بھی چھوڑ دے

(جلد ۱، صفحہ ۲۰ و ۲۱)

اسی طرح کی ایک اور مشہور مختصر روایت ہے:۔

الحیاء شعبة من الایمان — حیا ایمان کی ایک شاخ ہے

اس کی وضاحت میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام خطابیؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ حیا حیادار کو معاصی سے روکتی ہے اس لیے وہ ایمان میں سے ہے کیونکہ ایمان مامور من اللہ احکام کی تعمیل اور منہیات سے باز رہنے کا نام ہے۔ میرے خیال میں جس طرح انسان گناہوں سے ایمان کی وجہ سے باز رہتا ہے، اسی طرح حیا کی وجہ سے بھی وہ گناہوں سے کنارہ کش رہتا ہے، چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے۔

اذا لم تستح فاصنع ما شئت — جب تم میں حیا نہ ہو تو جو چاہے کرو

اس سے آپ کا منشا یہ ہے کہ حیا سے جس کا تعلق نہ ہوگا وہ جس طرح کے فواحش اور قبائح کو چاہے گا اختیار کرے گا۔ پس حیا ایمان کی طرح گناہوں سے روکنے کا سبب ہے اس لیے وہ ایمان کے شعبوں میں شمار کی گئی ہے" (ج ۱ ص ۳۵ و ۳۶)

ایک حدیث میں منافق کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں، (۱) جب بات کرے تو جھوٹ کہے، (۲) وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، (۳) امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے، امام بغویؒ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"یہ بات مسلمانوں کے انداز کے لیے کہی گئی ہے کیونکہ یہ حرکتیں نفاق کا باعث بنتی ہیں لیکن

اگر کوئی شخص اتفاقاً ان حرکتوں کا مرتکب ہوگیا تو اسے منافق نہیں کہیں گے، نفاق کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ عہد نبوی کے منافقین کی طرح کوئی آدمی ایمان کا اظہار کرے لیکن اس کے دل میں کفر چھپا ہوا ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ بظاہر دین کے حدود اور تقاضوں کا لحاظ رکھے لیکن باطن میں ان کی رعایت نہ کرے، ظاہر ہے کہ دوسری صورت میں نفاق کم درجے کا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

سباب المومن فسوق و قتاله کفر — مومن کو برا بھلا کہنا فسق اور اس سے قتال کرنا کفر ہے،

لیکن یہ کفر کی معمولی صورت ہے۔ باقی حضرت حسنؒ سے جو یہ مروی ہے کہ "یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں سے یہ تینوں افعال سرزد ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے بات کہی تو دروغگوئی کی، وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور امین بنائے گئے تو اس میں خیانت کی" تو اس کے سلسلہ یہ کہا جائے گا کہ ان لوگوں سے یہ حرکتیں اتفاقاً سرزد ہوئی تھیں، انھوں نے ان پر اصرار نہیں کیا تھا، بلکہ خود توبہ کیا اور اپنے والد بزرگوار سے بھی اپنے لیے استغفار کی درخواست کی تھی اس بنا پر نفاق کی علامتیں ان کے اندر راسخ نہیں ہوئی تھیں" (جلد اول ص ۷۰ و ۷۱)

بعض مشکل حدیثوں کا مفہوم ملاحظہ ہو، ردالوسوسہ کے باب میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

نحن احق بالشك من ابراهيم اذ قال رب ارني كيف تحي الموتى قال اولم تومن قال بلى ولكن ليطمئن قلبي

ہم حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شک کے زیادہ سزاوار ہیں جب انھوں نے کہا خداوندا تو مجھے دکھا کہ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اللہ نے

ورحم الله لوطا لقد كان ياوي الى ركن شديد ولو لبثت في السجن طول مالبث يوسف لاجبت الداعي،

کہا کیا تم کو اس کا یقین نہیں ہے بولے کیوں نہیں مگر میں اس لیے التجا کر رہا ہوں) تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے (حضرت لوطؑ پر خدا رحم کرے، وہ ایک بڑے سہارے کے پاس آتے تھے اور اگر حضرت یوسفؑ کی طرح میں طویل مدت تک قید میں رہا ہوتا تو رہائی کی دعوت دینے والے کی دعوت پر ضرور لبیک کہتا۔

امام بغوی نے اس حدیث کی مشکلات کو اس طرح حل کیا ہے:۔

"اسمٰعیل بن یحیی مزنی سے حکایت کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کے بارہ مین نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی شک ہوا تھا، اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بارہ مین کوئی شبہ ہوا تھا، ابوسلیمان خطابی کا بیان ہے کہ "نحن احق بالشك من ابراهيم" کہکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اپنے متعلق اور نہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ اعتراف فرمایا ہے کہ وہ شک وشبہ میں پڑ گئے تھے بلکہ آپ کا مقصد اپنے اور ان کے متعلق شک وشبہ کی نفی کرنا اور یہ بتانا ہے کہ جب مجھکو اس مین کوئی تردد نہیں ہے کہ اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آخر کس طرح اس مین شک ہو سکتا تھا، یہ ارشاد مبارک آپ کے غایت انکسار اور غیر معمولی تواضع کا ثبوت ہے، اور اس میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جانب سے جو سوال کیا گیا تھا، وہ ان کے شک کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ یہ علم کی زیادتی کی طلب تھی کیونکہ

مشاہدہ سے جو معرفت اور طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ استدلال سے نہیں حاصل ہوتی۔

حضرت یوسفؑ کے متعلق آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ ان کے صبر واستقامت کی تعریف ہے، کیونکہ عرصۂ دراز تک قید خانہ مین پڑے رہنے کے باوجود جب بادشاہ کا قاصد ان کے پاس رہائی کا پروانہ لیکر آیا تو انھوں نے عام مجرموں کی طرح جیل سے نکلنے مین کوئی عجلت نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ :۔

ارجع الى ربك فاسأله ما بال النسوة اللاتي قطعن ايديهن (يوسف)

تم اپنے آقا کے پاس لوٹ کر ان سے دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

اس سے حضرت یوسفؑ کا مقصد لوگوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ وہ بے خطا تھے، اور انھیں محض ظلم کی بنا پر قید وبند مین ڈالا گیا تھا، یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات از راہ انکسار فرمائی ہے، آپ کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ اگر حضرت یوسفؑ کی جگہ آپ ہوتے تو واقعۃً رہا ہو جانے کے لیے عجلت اور جلد بازی کرتے تواضع بڑے آدمی کو چھوٹا اور بلند کو پست نہیں کرتی ہے، بلکہ اس سے اس کا فضل وکمال ظاہر ہوتا ہے، اور یہ متواضع کی شان وعظمت کو بڑھا دیتی ہے،

حضرت لوطؑ کے بارہ میں آپ کے ارشاد سے ان کے اُس قول کی جانب اشارہ ہے، جو قرآن مین یون نقل ہوا ہے،

لو ان لي بكم قوة او آوي الى ركن شديد (هود-۸۰)

اے کاش مجھکو تمھارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ سکتا۔

یعنی اگر میرے کنبہ کے لوگ ہوتے تو وہ تم لوگوں کے ظلم وتعدی کو روکتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے رحمت کی دعا اس لیے کی تھی کہ وہ مہمانوں کے ساتھ اپنی قوم کی بدسلوکی دیکھکر جزع فزع کرتے ہوئے سہوا یہ کہہ اٹھے کہ "میں کسی زبردست سہارے کی آڑ لیتا، حالانکہ سب سے بڑا سہارا تو خود خدا کی ذات ہے۔" (ج ا ص ۱۱۵ تا ۱۱۶)

ایک حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر نفس کا مستقر چاہے وہ دوزخ ہو یا جنت لکھا جا چکا ہے، اور اس کا سعید و شقی ہونا بھی تحریر میں آچکا ہے، ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول کیوں نہ ہم لوگ اپنے نوشتہ ہی پر بھروسہ کریں اور عمل ترک کر دیں، ارشاد ہوا نہیں تم لوگ عمل کرو، ہر شخص کو آسانی عطا کی جاتی ہے یعنی بدبخت لوگوں کے لیے بدبختوں کا عمل آسان کیا جاتا ہے اور سعادت مند لوگوں کے لیے اہل سعادت کا عمل آسان کیا جاتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔

فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للعسری واما من بخل واستغنی وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری۔ (لیل: ۵ تا ۱۰)

سو جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات کو سچ مانا تو اس کے لیے ہم آسانی کی جگہ کو آسان کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے نیازی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے مشکل جگہ کو آسان کریں گے۔

امام بغوی نے اس کی تشریح میں لکھا ہے۔

"صحابہ کا یہ کہنا کہ [افلا نتکل علی کتابنا وندع العمل] کیا ہم اپنے نوشتہ پر بھروسہ کرکے عمل سے دستکش ہو جائیں، ایک ایسا مطالبہ تھا جو بندگی اور عبودیت کو معطل بنا دینے کے

ہم معنی تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق نوشتے کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ دراصل بندوں کے بارہ میں خدا کے علم غیب کی خبر تھی جو ان کے خلاف ایک قسم کی حجت بھی تھی، مگر انھوں نے اس کو ترک عمل کا بہانہ بنانا چاہا۔ اس لیے آپ نے بتایا کہ یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک کا تعلق باطن اور دوسرے کا ظاہر سے ہے۔ اور تقدیر کے معاملہ کے باوجود ممکن ہے بندوں کو عمل اور بندگی کا مکلف اس لیے بنایا گیا ہو تاکہ وہ اس باطن سے خائف رہیں جو غیب میں ہے، اور ظاہر سے امید رکھیں، یہی خوف ورجا اور امید وبیم عبودیت کے دو ڈینے ہیں، ان ہی سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ آپ نے بتایا کہ ہر شخص کے لیے اس چیز کو آسان کیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے اور انسان کا دنیوی عمل اس کے اخروی انجام کی دلیل ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے دو مثالوں پر غور کرنا چاہئے: انسان کے رزق کا معاملہ گو مقسوم ومقدر ہے مگر اس کو کسب اور کمائی کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اس کی عمر کے لیے اجل مقرر ہے، مگر اس کے باوجود طبی علاج سے کام لیا جاتا ہے، ان دونوں مثالوں میں علت پوشیدہ اور غائب چیز ہے، اور ظاہر ایک موہوم اور خیالی سبب ہے، لیکن عوام وخواص سب کا اتفاق ہے کہ ان کے ظاہری موہوم سبب کو باطنی پوشیدہ علت کی وجہ سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ (ج اول ص ۱۳۳)

استنباطات بعض حدیثوں سے امام بغوی نے مفید نتائج اخذ کئے ہیں، ذیل میں ان کے استنباطات کی چند لطیف اور دلچسپ مثالیں نقل کی جاتی ہیں، ایک حدیث مین نماز کی حالت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو کندھے پر لیے رہنے کا ذکر ہے، راوی کا بیان ہے کہ جب آپ سجدہ مین جاتے تو ان کو اتار دیتے اور کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے تھے۔

اس سے امام بغوی رحؒ نے حسب ذیل استنباطات کیے ہیں ۔
"(۱) اہل وعیال اور چھوٹے بچوں سے حسن معاشرت اور بہتر سلوک کرنا چاہیے ۔
(۲) معمولی اور تھوڑے کام سے نماز باطل نہیں ہوتی ، (۳) نماز پڑھتے وقت آستین کے
اندر یا کندھے پر کسی چیز کو لیے رہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کے لیے عمل کثیر کی ضرورت
نہ پڑے ، (۴) اگر بچوں کے کپڑے اور جسم پاک ہوں تو نماز میں ان کو لیے رہنے میں کوئی مضائقہ
نہیں ، محمد بن حسن رحؒ کے نزدیک بچوں کے کپڑے کی وجہ سے نماز مکروہ ہے کیونکہ اس میں گندگی اور آلائش
عموماً رہا کرتی ہے ، (۵) اگر نماز میں کسی جاندار چیز کو اٹھائے تو اسکی اندرونی نجاست نماز
کی صحت کے لیے مانع نہیں ہوتی بشرطیکہ اس کا بیرونی حصہ پاک ہو کیونکہ آدمی کو ظاہری
طہارت کا مکلف بنایا گیا ہے اور اس سے اپنے ظاہر کو پاک و صاف رکھنے ہی کا مطالبہ
کیا گیا ہے ۔ لیکن اگر کوئی ایسی شیشی نماز میں لیے ہو جو اگرچہ بند ہو لیکن اس کے اندر نجاست ہو
تو نماز صحیح نہیں ہوگی ، (۶) محارم کو چھونے سے طہارت زائل نہیں ہوتی[1]" (ج ۳ ص ۲۶۴ و ۲۶۵)
ایک حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی وجہ سے نماز میں

[1] اس حدیث کو بعض علما نے منسوخ قرار دیا ہے ، اور بعض نے اسکو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں
بنایا ہے ، بعض کے نزدیک نماز میں ایسا صرف ضرورۃً کیا جاسکتا ہے ۔ مگر شوافع اور امام نووی وغیرہ کا خیال ہے کہ
اس حدیث کے اندر قواعد شرع کے منافی کوئی بات نہیں ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح آدمی کا جسم پاک ہو اور اسکی
اندرونی آلائشوں سے نماز میں فرق نہیں آتا اسی طرح بچوں کے کپڑے اور جسم بھی اگر پاک ہوں اور ان کے اندر کی نجاست
ظاہر و معلوم نہ ہو تو نماز ہو جائے گی ، اسیطرح اگر عمل قلیل متفرق طور پر کیا جائے تو نماز باطل نہیں ہوگی ، اور نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام بیان جواز ہی کے لیے کیا تھا ، اس حدیث سے بچوں کو مسجد میں لیجانے کا ثبوت بھی ملتا
ہے ، رہی وہ حدیث جس میں بچوں کو مسجدوں میں لیجانے کی ممانعت ہے تو اسکو علمائے فن نے ضعیف قرار دیا ہے ۔

دیر ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھانا شروع کیا اسی اثنا میں آپؐ تشریف لائے تو لوگوں
نے حضرت ابوبکرؓ کو متوجہ کرنے کے لیے تالیاں بجائیں ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا کہ وہ
نماز پڑھاتے رہیں ، حضرت ابوبکرؓ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا مگر نماز پڑھانے
میں ان کو تامل ہوا اسی لیے وہ پیچھے ہٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی ، نماز ختم
ہونے کے بعد آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ میرے اشارہ کے باوجود تم کیوں پیچھے چلے آئے ،
انھوں نے کہا ابن ابی قحافہ کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ آپؐ کی موجودگی میں امامت کرتا ،
پھر آپؐ نے لوگوں سے تالیاں بجانے کی وجہ پوچھی اور فرمایا کہ جب نماز میں اس طرح کی کوئی
بات پیش آجائے تو سبحان اللہ کہو تصفیق (تالی بجانا) تو عورتوں کے لیے ہے

امام بغوی رحؒ نے اس حدیث کے ضمن میں متعدد فوائد تحریر کیے ہیں ۔
(۱) "نماز کو اول وقت ہی میں ادا کر لینا چاہیے ، کسی کا انتظار کرنا اور نماز میں تاخیر کرنا مناسب نہیں
ہے ، کیونکہ صحابہ کرامؓ نے وقت ہو جانے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرکے تاخیر نہیں
کی اور آپؐ نے ان کے اس کام پر کوئی ناگواری اور برہمی نہیں ظاہر کی ، (۲) التفات سے نماز باطل
نہیں ہوتی جبتک کہ آدمی کا پورا جسم قبلہ کی جانب سے نہ ہٹ جائے ، (۳) عمل یسیر سے نماز
باطل نہیں ہوتی کیونکہ صحابہ کے تالیاں بجانے پر آپ نے نماز کو دہرانے کا حکم نہیں دیا ، (۴)
نماز پڑھنے والے کے اپنی جگہ سے تھوڑا آگے پیچھے ہٹ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ، (۵)
کوئی واقعہ نماز میں ہو تو تصفیق (تالیاں بجانا) عورتوں کے لیے ہے ، (۶) اور مردوں کے لیے
ایسی حالت میں تسبیح ہے ، (۷) امام کو متوجہ کرنے کے لیے مقتدی کو تسبیح پڑھنا چاہیے ،
کیونکہ صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو متوجہ کرنے کے لیے تالی بجائی تو انکو تسبیح کا حکم دیا گیا (۸)
فضل و انعام کے موقع پر نماز کے اندر خدا کا شکر بجالانے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھانا مباح ہے ؛

اسی لیے حضرت ابوبکرؓ کے اس طرز عمل پر آپؐ نے کوئی نکیر نہیں کی (۹) ایک ہی نماز میں کسی کا کبھی مقتدی اور کبھی امام ہونا جائز ہے، اور اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھنا شروع کرے تو اسکے لئے درمیان میں امام کے ساتھ شامل ہوجانا اور اسکی اقتدا کرنا درست ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے نماز کے اندر آنحضورؐ کی اقتدا کرلی تھی۔ (۱۰) ایک ہی نماز میں دو اماموں کی اقتدا کی جاسکتی ہے، کیونکہ صحابہ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز شروع کی تھی، مگر پھر انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرلی۔ (۱۱) حضرت ابوبکرؓ سے رسول اللہؐ کا یہ فرمانا کہ اپنی جگہ پر رہو یعنی امامت کرتے رہو کوئی واجب اور لازمی امر (حکم) نہ تھا بلکہ یہ محض تقدیم و اکرام کے لیے تھا۔ کیونکہ اگر آپؐ کا حکم لازمی ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اسکی مخالفت نہ کرتے۔ (ج ۳ ص ۲۶۳ تا ۲۶۵)

قیاس استنباط و استخراج کی طرح امام بغوی نے قیاس سے بھی کام لیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ "تم میں سے جو لوگ ہمارے بعد زندہ رہیں گے، وہ بکثرت اختلافات دیکھیں گے، ایسی حالت میں تم لوگ میری اور خلفائے راشدینؓ کی سنتوں کی پیروی کرنا اور نئی نئی باتوں سے بچنا۔" امام بغوی نے پہلے اس کی تشریح کی ہے کہ:-

"اس میں رسول اللہ نے بدعتوں کے ظہور اور نفسانی خواہشات کے غلبہ و استیلا کی جانب اشارہ کیا ہے، اور یہ ہدایت کی ہے کہ ایسے پرآشوب زمانہ میں پوری مضبوطی اور کوشش سے میری اور میرے خلفا کی اقتدا کرنا اور ان چیزوں سے پرہیز کرنا جو ہماری سنت کے خلاف ہوں۔"

پھر اس فرمان نبوی کی روشنی میں ان کا قیاس ملاحظہ ہو:-

"اگر خلفائے راشدین میں سے کسی ایک قول کے خلاف دوسرے صحابہ کا قول ہو تو خلیفہ راشد ہی کے قول کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔"

ایک روایت میں نماز کے اندر سانپ اور بچھو کو مارنے کا ذکر ہے، اس سے پہلے تو وہ یہ استنباط کرتے ہیں کہ نماز میں تھوڑے عمل سے خلل نہیں ہوتا، اور ایک ہی موقع پر مسلسل دو بار کسی کام کو کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ بچھو ایک ضرب میں نہیں مرتا بلکہ عموماً دو تین ضربوں میں مرتا ہے، ایسی صورت میں نماز اسی وقت باطل ہوگی جب کوئی کام پے درپے کثرت سے کئی بار کیا جائے، علاوہ ازیں وہ سانپ اور بچھو پر قیاس کرکے ہر موذی اور ضرر رساں چیز جیسے بھڑ وغیرہ مارنے کو مباح قرار دیتے ہیں، صحابہ اور عام اہل علم نے سانپ اور بچھو کو نماز میں مارنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک یہ درست نہیں ہے، اور وہ اس کو نماز میں شغل سمجھتے ہیں جو ممنوع ہے، مگر بغویؒ کہتے ہیں کہ جب سنت نبوی موجود ہے تو اس کی پیروی کرنا ہی بہتر ہے، ایک حدیث میں اضاعت مال کو ان چیزوں میں بتایا گیا ہے، جن سے اللہ ناراض ہوتا ہے، امام بغوی نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ان کی فقہی بصیرت اور قیاس میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"گناہ اور معصیت کے کاموں میں مال خرچ کرنے کو اضاعت مال کہا گیا ہے، اور یہی وہ اسراف ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے لیکن عمارتوں کی تعمیر میں فضول خرچی، بیجا آرائش و زیبائش اوڑھنے بچھونے اور ملبوسات میں میانہ روی سے تجاوز اور سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال وغیرہ بھی اضاعت مال میں داخل ہے، اگر کسی کے پاس غلام اور بار برداری اور سواری کے جانور ہوں اور وہ اس کی غفلت، بدتدبیری اور مناسب دیکھ بھال نہ کرنے سے ہلاک ہوجائیں تو یہ بھی اضاعت مال ہے۔ اسی طرح اگر دو شخصوں کے درمیان کوئی ایسی مشترک

چیز ہو جو تقسیم کر دینے کے بعد مفید اور قابل انتفاع نہ رہ جائے تو ایسی چیز کی تقسیم بھی اضاعت مال ہے جیسے تلوار، چھوٹا غسل خانہ اور چھوٹی چکی وغیرہ کیونکہ تقسیم کے بعد ان سب چیزوں کی منفعت باقی نہیں رہتی۔" (جلد اول، ص ۲۰۲)

حسنِ استدلال | امام بغوی نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل بیان کیے ہیں ان میں قوت اور وزن بھی ہے، اور وہ حسنِ استدلال کا نمونہ بھی ہیں، ان کے طرز استدلال کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:۔

حدیث میں جمعہ کے دن غسل کرنے کو واجب بتایا گیا ہے (غسل یوم الجمعۃ واجب) وہ فرماتے ہیں کہ اس سے قطعی و لازمی وجوب مراد نہیں ہے جیسے ایک شخص اپنے ساتھی سے جب یہ کہتا ہے کہ تیرا حق مجھ پر واجب ہے [حقک علی واجب] تو اس کا مقصد ایسا قطعی اور حتمی وجوب نہیں ہوتا جس کو چھوڑنے کی مطلق گنجائش نہ ہو، اس کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت عثمانؓ تشریف لائے، حضرت عمرؓ نے باآواز بلند کہا کیا یہی آنے کا وقت ہے؟ انھوں نے جواب دیا امیر المومنین میں بازار سے لوٹا تو اذان سنی، اس کے بعد وضو کر کے چلا آرہا ہوں، ارشاد ہوا کیا تم نے صرف وضو پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم غسل کا بھی حکم دیتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر غسل واجب ہوتا تو حضرت عمرؓ کی تنبیہ کے بعد حضرت عثمانؓ واپس جا کر غسل کر کے آتے اور خود حضرت عمرؓ بھی ان کو غسل کے لیے نہ جاتے دیکھ کر ضرور لوٹا دیتے۔

بعض جگہ انھوں نے احادیث کے غلط مفہوم کی تردید کرتے ہوئے بھی عمدہ دلائل تحریر کیے ہیں جیسے نماز کے بعد کی دعا میں یہ پڑھا جاتا ہے کہ (ولا ینفع ذا الجد منک الجد) اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جَد کا لفظ بفتح جیم ہے، اس کے معنی غنی، رزق اور حصہ ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ غنی کو اسکا غنا فائدہ نہ دیگا بلکہ نیک اعمال اس کے کام آئیں گے، یہی مفہوم قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون (شعراء۔ ۸۸) — جس دن (قیامت میں) نہ مال کام آئے گا، اور نہ بیٹے۔

ابو عمرو کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کو جِد (جیم کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور اس کے معنی اجتہاد فی العمل (سعی و کوشش) لیے ہیں لیکن یہ تاویل قرآن کے منشا کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو مسلمانوں کو سعی و عمل کی دعوت دی ہے، چنانچہ فرمایا:۔

واعملوا صالحا (مومنون۔ ۵۱) — اور تم لوگ نیک کام کرو۔

اس آیت میں جد و کوشش اور عمل کا حکم دیا گیا ہے اور جب اللہ نے خود جد و عمل پر ابھارا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سعی و عمل انسان کے کام نہ آئیں گے۔" (ج ۳ ص ۲۲۶)

حکم و مصالح کا ذکر | امام بغوی نے اپنی شرح میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان کی ہیں، چنانچہ یہ جو حدیث ہے کہ تم لوگ تین مسجدوں (مسجد کعبہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ) کے سوا اور کسی جگہ کے لیے شد رحال نہ کرو تو اسکی مصلحت یہ بتائی ہے کہ:۔

"ان مساجد کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی مسجدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان کے اقتدا کی تعلیم دی ہے، اس کا ارشاد ہے:۔

فبھداھم اقتدہ (انعام۔ ۹۰) — پس ان (انبیا) کی اقتدا کرو۔ (ج ۲ ص ۳۳۰)

رسول اللہؐ نے عقل و دانش والے لوگوں کو نماز میں اپنے قریب کھڑے ہونے کا حکم

دیا ہے، اس کی غرض یہ بتاتے ہیں۔

"عقلمندوں کو اپنے قریب رہنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ وہ آپ سے نماز کو سیکھیں اور سمجھیں اور اگر کوئی واقعہ پیش آجائے تو امامت میں آپ کی جانشینی کریں ایک اور حدیث میں ہے کہ مہاجرین وانصار کا نماز میں آپ کے قریب ہونا آپ کو پسند تھا، تاکہ وہ آپ کی نماز کو محفوظ کرسکیں۔" (ج ۳ ص ۳۰۶)

ایک حدیث میں رسول اللہ کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اسکی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کو بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں مل تھی اسلئے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کے پاؤں میں زخم تھا، اس لیے بیٹھنا آپ کے لیے دشوار تھا، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ کے گھٹنوں میں تکلیف تھی اس لیے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ اسکی تیسری وجہ امام شافعیؒ سے یہ منقول ہے کہ اہل عرب پشت کے درد کی بنا پر علاجاً بطور دوا کے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو بھی یہ تکلیف رہی ہو۔ ورنہ آپ کا عام معمول اور مالوف عادت بیٹھ کر پیشاب کرنے کی تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ بیان کرے کہ رسول اللہ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اس کی بات نہ مانو اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ان کو آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو اس سے منع کیا لیکن ظاہر ہے یہ حکم تحریمانہ تھا، بلکہ تادیباً تھا۔" (ج ۱ ص ۳۸۰)

کسوف شمس کے باب میں یہ روایت ہے کہ

ان الشمس والقمر آیتان من — بیشک سورج اور چاند خدا کی نشانیوں

آیات اللہ — میں سے دو نشانیاں ہیں۔

امام بغویؒ اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں سورج اور چاند گرہن کو کارخانہ عالم میں تغیر وانقلاب رونما ہونے کا سبب اور موجب خیال کرتے تھے جیسے کسی کی موت ہوجائے یا کوئی بڑا نقصان واقع ہوجائے تو سورج اور چاند میں گرہن لگتا ہے، رسول اللہؐ نے ان کے خیال کو باطل قرار دیا اور بتایا کہ درحقیقت چاند اور سورج گرہن خدا کی نشانیاں ہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ یہ دونوں خدا کی مخلوق اور اس کے تابع فرمان ہیں، ان کو نہ دوسروں پر کسی طرح کا اختیار ہے اور نہ یہ خود اپنی ہی مدافعت پر قدرت رکھتے ہیں، اسی لئے ان میں گرہن کے وقت آپ نے ذکر الٰہی اور نماز کی تلقین کی ہے، اس تعلیم کا مقصد ان جاہلوں کے باطل خیالات کی تردید ہے، جو ان مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے، اور ان کو دنیا کے واقعات و حوادث میں موثر سمجھتے تھے، ایسے وقت میں نماز اور ذکر کی تلقین سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود ہے کہ جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے سب اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، بعض علماء نے ذکر و نماز کے حکم کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورج اور چاند قرب قیامت کی علامتیں ہیں جیسا کہ فرمایا:۔

فاذا برق البصر وخسف القمر — تو جب آنکھیں پتھرا جائیں اور چاند

وجمع الشمس والقمر — گہنا جائے، اور سورج اور چاند یکجا

(قیامہ ۷-۹) — کردیے جائیں،

یہ نشانیاں لوگوں کیلئے تنبیہ وتخویف کا سامان ہیں ان سے وہ توبہ اور استغفار کی جانب مائل ہوتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ ان کے ذریعہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، اور خود قرآن مجید میں ہے:۔

وما نرسل بالآیات الا تخویفا (اسراء ۵۹) — اور ہم نشانیاں صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجتے ہیں۔

(ج ۴ ص ۳۶۳، ۳۶۴)

اختلاف آراء ومسالک کا ذکر

شرح السنہ میں اہل علم کے مختلف آراء و مسالک ذکر کیے گیے ہیں، اور یہ نقد وخلاف اور احکام و مسائل کا عمدہ ذخیرہ ہے، مگر اس میں صرف فقہی اختلافات ہی نہیں تحریر کیے گئے ہیں، بلکہ حدیثوں کی شرح وتوجیہ اور دوسری نوعیت کے بھی اختلافات نقل کیے گئے ہیں پہلے شرح وتوجیہ کے متعلق علمائے فن کے اختلافات کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے،

ایک متفق علیہ حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں (لا یزنی الزانی وھو حین یزنی مومن ولا یسرق السارق وھو حین یسرق مومن ولا یشرب الخمر وھو حین یشربھا مومن) اس کے مفہوم کی تعیین میں علمائے فن کے اختلافات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک گروہ کے نزدیک یہ بات اگرچہ بطور خبر بیان ہوئی ہے، لیکن اس سے نہی مقصود ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ مومن کو زناکار، چوری کرنے والا اور شراب پینے والا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح کے گھناؤنے اعمال اس کے شایان شان نہیں ہیں، دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسا زجر و توبیخ کے لئے کہا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی واقعتہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، یا پھر اس کا مقصد انذار اور برے انجام سے ہوشیار کرنا ہو، ایسی صورت میں حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر آدمی ان معصیتوں کا عادی ہو جائے تو اس کے ایمان کے ضد یعنی کفر میں پڑ جانے کا خطرہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ "جو چراگاہ کے پاس اپنے جانور چرائے گا وہ قریب ہے کہ اس میں انکو داخل کردے"

اس حدیث کا ایک مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ اس سے ایمان کا نقص اور کمی مراد ہے یعنی یعنی، زناکار اور چور وغیرہ زنا اور چوری وغیرہ کے ارتکاب کے وقت مومن کامل نہیں رہتے بلکہ فجور کے اقدام سے پہلے اور تائب ہونے کے بعد مکمل ایمان والے ہوتے ہیں جیسا کہ

ایک دوسری روایت میں ہے،

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ — بے امانت والے کے لیے ایمان نہیں'

اس روایت سے ایمان کامل کی نفی مراد ہے، ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے، تقریباً یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے، اور وہ اس کے اوپر چھتری کی طرح سایہ فگن رہتا ہے، چنانچہ جب وہ بدکاری سے باز آتا ہے تو ایمان اس کی طرف پلٹ آتا ہے۔ (ج اول ص ۹۰ و ۹۱)

بعض جگہ فنی اختلافات بیان کیے گئے ہیں، مثلاً نقل و روایت کے متعلق ائمہ فن کے مختلف اقوال ملاحظہ ہوں:۔

"حدیث کے معنی و مفہوم (ہو بہو رسول اللہؐ سے منقول الفاظ کو نقل کرنے کا اہتمام نہ کیا جائے بلکہ راوی صرف آپؐ کے مفہوم ومنشا کو بیان کر دے) کی نقل و روایت میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت اس میں رخصت کی قائل ہے، واثلہ بن اسقع فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ تم لوگوں سے حدیث کے معنی و مفہوم کو بیان کر دیں تو اسے کافی سمجھو، حسن شعبی اور نخعی کا بھی یہی خیال ہے، ابن سیرین سے روایت کی گئی ہے کہ "میں دس آدمیوں سے حدیث سنتا ہوں گو ان کے الفاظ مختلف ہوتے ہیں، مگر معنی یکساں ہوتا ہے"، مجاہدؒ کا قول ہے کہ "اگر چاہو تو حدیث کے مفہوم میں کمی کر دو، مگر اس میں کوئی اضافہ نہ کرو" سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں "اگر میں تم سے کہوں کہ میں نے بعینہ اسی طرح حدیث بیان کی ہے جیسے میں نے اسکو سنا تھا تو تم لوگ میری بات نہ ماننا کیونکہ روایت تو بالمعنی ہوتی ہے"، وکیع کا بیان ہے کہ اگر معنی کے نقل و بیان کی

گنجائش نہ ہوتی تو لوگ سخت دشواری میں پڑ جاتے۔

دوسری جماعت کے نزدیک لفظی متابعت ضروری ہے، یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، قاسم بن محمدؒ، ابن سیرینؒ رجاء بن حیوۃؒ، مالک بن انسؒ، ابن علیہؒ، یزید بن زریعؒ، اور وہیبؒ کا قول ہے، امام احمدؒ اور یحییٰ بن معینؒ کی بھی یہی رائے ہے۔" (جلد اول ص ۲۳۷ و ۲۳۸)

اسی بحث میں آگے چلکر انھوں نے شیخ کے سامنے قرأت وعرض اور مناولت ومکاتبت کے جواز وعدم جواز کے متعلق علمائے فن کے مختلف آرا تفصیل سے نقل کئے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہ بحث قلم انداز کی جاتی ہے، رہے فقہی اختلافات تو ان سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے، ذیل میں فقہی اختلاف کی صرف ایک مثال دی جاتی ہے تاکہ اس لحاظ سے بھی کتاب کی خصوصیت سامنے آجائے جو چیز آگ پر پکی ہوئی ہو اسکو کھانے سے وضو لازم ہے یا نہیں، اس کے متعلق صحابہ وتابعین اور فقہائے امصار کے اقوال ملاحظہ ہوں:-

"آگ پر پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو ضروری نہیں ہے، یہی خلفائے راشدین اور اکثر اہل علم صحابہ وتابعین وغیرہ کا مسلک ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک اس کی وجہ سے وضو ضروری ہو جاتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ شکر کھانے کے بعد وضو کرتے تھے، ان لوگوں کا استدلال حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت پر مبنی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز آگ سے پکی ہو اس کو کھانے کے بعد وضو کر لیا کرو خواہ وہ پنیر ہی کیوں نہ ہو۔ ....

مگر حضرت جابرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا کہ وہ آگ سے پکنے والی چیز کھانے کے بعد وضو نہیں کرتے تھے، اور ابن عمرؓ سے جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "وضو اسوقت لازم ہوتا ہے جب کوئی چیز آدمی کے جسم سے خارج ہو لیکن اگر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو تو وضو نہیں، کیونکہ آدمی کے جسم میں پاکیزہ

اور عمدہ چیز جاتی ہے اور ناپاک اور خراب چیز اس سے خارج ہوتی ہے،

محدثین کی ایک جماعت نے خاص طور پر اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کو ضروری قرار دیا ہے، امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے اور ان دونوں بزرگوں نے حضرت براءؓ ابن عازب کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا جائے گا، تو آپؐ نے فرمایا ہاں! اور جب بکری کے گوشت کھانے سے وضو کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے کہا نہیں! اسی طرح جب آپؐ سے اونٹوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے کہا وہاں نماز نہ پڑھو لیکن جب بکریوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ہاں وہاں پڑھ لو۔

مگر عام فقہا نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد بھی وضو کو لازمی نہیں قرار دیا ہے، یہ لوگ حدیث کو نظافت کیلئے صرف ہاتھ اور منھ دھونے پر محمول کرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے دودھ پینے کے بعد کلی کیا، اور فرمایا کہ اس میں چکناہٹ اور چربی ہوتی ہے، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ کھانے کے پہلے وضو کرنے سے فقر وفاقہ دور ہوتا ہے اور کھانے کے بعد وضو کرنے سے گناہ زائل ہوتے ہیں لیکن غالباً وضو سے انکی مراد دونوں ہاتھ دھونا ہے، قتادہؒ کا بیان ہے کہ جس نے اپنے ہاتھ دھوئے اس نے گویا وضو کیا۔"

اس سے اور دوسری مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، محدثین اور مشاہیر علماء وفقہا کے اقوال نقل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں،

بعض جگہ مختلف مذاہب ومسالک تحریر کرنے کے بعد مصنف اپنی مرجح رائے بھی بیان کرتے ہیں، وہ شافعی المذہب تھے اسلئے امام شافعیؒ کے اقوال زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں، اور عموماً اسی کو مرجح بھی قرار دیتے ہیں، لیکن کہیں کہیں اس مسلک کو ترجیح دیتے ہیں، جو حدیث وسنت کے زیادہ قریب اور موافق ہوتا ہے۔

(باقی)

عرفی شیرازی کا ایک مطبوعہ قصیدہ

از۔ ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری، لکھنؤ،

قصائد عرفی شیرازی، مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ میں، ۱۱۹ تا ۱۲۱ صفحات پر عرفی شیرازی کا ایک قصیدہ "در منقبت جناب امیر علیہ السلام" کے عنوان سے ملتا ہے[1] جس کا مطلع ذیل میں درج ہے،

تبارک اللہ ازین آسمان شتاب کرنگ — کہ نعلِ آئینہ رنگش ندید رنگِ درنگ

اس مطلع کے بعد گیارہ اور اشعار ہیں جن میں اُسی "آسمان شتاب کرنگ" کی تعریف کی گئی ہے جس کا ذکر مطلع میں ہے۔ ان بارہ اشعار کے بعد پھر ایک مطلع ہے جو یہ ہے،

ہمہ کشیدہ ام از لوح دعا بیرنگ — نہ تشنگی کشِ آہم نہ آزردہ جیشِ رنگ

اس مطلع کے بعد پچیس اور اشعار ہیں جن کے بعد قصیدہ ختم ہوجاتا ہے۔

یہ قصیدہ نولکشور پریس سے شائع شدہ قصائد عرفی اور غلام حسین جواہری کے مرتب کردہ تہران سے شائع ہونے والے کلیات عرفی کے نسخوں کے علاوہ چند دوسرے اہم خطی نسخوں میں بھی میری نظر سے گذرا جن میں سب سے اہم کلیات عرفی کا وہ نسخہ ہے جو خانخانان کے کتب خانہ میں کلام عرفی کے مسودات کے چوری ہوجانے کے بعد ناظم تبریزی نے ۱۰۳۳ھ میں مرتب کیا تھا، اس نسخہ میں نیز دوسرے اہم نسخوں میں بھی، جن میں خانخانان عبدالرحیم کے حکم سے اور محمد قاسم سراپا کی کوشش سے مرتب شدہ کلیات عرفی کی نقلیں بھی شامل ہیں، اور قصائد عرفی کی مختلف

[1] غلام حسین جواہری کے ترتیب دادہ نسخہ کلیات عرفی مطبوعہ تہران میں یہ قصیدہ صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۷ پر ملتا ہے،

شرحوں میں قصیدہ اسی طور سے پایا جاتا ہے، جیسے مذکورہ مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے، سوائے اسکے کہ ان نسخوں میں ترتیب و تعداد اشعار مطبوعہ نسخوں سے کچھ مختلف ہے،

عرفی کے زمانۂ حیات میں کلیات عرفی مرتب نہ ہوسکا تھا، اور عرفی کے انتقال کے بعد جن مسودات کی بنیاد پر کلیات عرفی مرتب ہوا ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ بہت ہی ابتر حالت میں تھے۔ مسودات کی اسی پراگندگی کی وجہ سے جو کلیات مرتب ہوا، اس میں متعدد قصائد کے اشعار خلط ملط ہوگئے، اور کئی قصیدوں میں ایسے اشعار شامل ہوگئے ہیں جو حقیقتاً ان قصائد کے نہیں ہیں، اور انھیں ان ہی زمینوں میں دوسرے قصائد میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ راقم الحروف کو مذکورۂ بالا قصیدہ بھی ...... ایسی ہی ایک نظم معلوم ہوتا ہے، جس میں دو مختلف قصیدوں کے اشعار خلط ملط ہوگئے ہیں، اور اس بے ترتیبی کی وجہ سے قصیدہ کا وہ حسن باقی نہیں رہ گیا جس کی عرفی جیسے شاعر سے امید کی جاسکتی ہے۔

یہ قصیدہ جیسا کہ مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ کسی آسمان شتاب گھوڑے کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے ابتدائی بارہ اشعار اسی "آسمان شتاب کرنگ" کی تعریف میں ہیں۔ ان اشعار کے بعد مطلع ثانی اور اس کے بعد نو دوسرے اشعار شاعر کی اپنی فطرت و طبیعت سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد گریز کا ایک شعر ہے، جس کے بعد مدح کے پندرہ اشعار ہیں اور مندرجۂ ذیل شعر پر قصیدہ ختم ہوجاتا ہے،

بزود تر بکف آرم عنانِ معنی را — کہ ہیبتِ تو ربایدز روی اعدا زنگ

یہ آخری شعر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اُسے قصیدہ کا آخری شعر ہونا چاہیے، بلکہ اس کے بعد کچھ اور شعر بھی ہونگے جو اب کسی نسخہ میں نہیں ملتے۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار کہے ہی نہ گئے ہوں۔

قصیدۂ مذکورہ کے اشعار کی وہ ترتیب جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، درست نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ گھوڑا (خواہ وہ براق ہی کیوں نہ ہو) کی تعریف سے اگر کسی قصیدے کی ابتدا کی جائے تو اس کے بعد اپنی طبیعت کے متعلق اشعار اور ان کے بعد گریز و مدح کچھ بے معنی سے معلوم ہوتے ہیں، ان حالات میں دو ہی باتیں ممکن معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ قصیدہ کے ابتدائی بارہ (۱۲) اشعار جن میں "آسمان شتاب کرنگ" کا ذکر کیا گیا ہے، کسی ایسے قصیدہ کی تشبیب ہے جو براق یا کسی اہم شخصیت کے گھوڑے کی تعریف میں کہا گیا، اور یہ قصیدہ محض تشبیب کے مندرجہ ذیل شعر تک پہونچ کر نامکمل ختم ہو جاتا ہے۔

غش معارج ازو کار گفتم دخجلم ز بہر آنکہ نہ راضی بود ز رنگ برنگ

اور ان ابتدائی بارہ (۱۲) اشعار کا تعلق بعد کے چھبیس (۲۶) اشعار سے قطعاً نہیں ہے جو مندرجۂ ذیل مطلع سے شروع ہوتے ہیں۔

منم کہ شیشہ ام از لوح مدعا بیرنگ ز تشنگی گش آبم نہ آرزو چش رنگ

اور یہ بعد کے چھبیس اشعار کسی دوسرے ہی قصیدہ کے اشعار ہیں جو پہلے قصیدہ کی طرح نامکمل رہ گیا، دوسرے یہ کہ یہ قصیدہ (اگر اسے ایک ہی قصیدہ سمجھا جائے۔) اصل میں دوسرے مطلع سے شروع ہوتا ہے، اور گھوڑے کی تعریف میں بارہ (۱۲) اشعار اس کے آخری اشعار ہیں۔

قصیدۂ مذکور کی مندرجۂ بالا ترتیب یا تقسیم کا میرا خیال اسوقت تک محض گمان ہی رہا، جبتک کہ کلیات عرفی کا ۱۰۰۰ھ کا نقل شدہ ایک نہایت ہی اہم نسخہ میری نظر سے نہ گذرا۔ اس نسخہ (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے) میں راقم الحروف کو یہ قصیدہ دو حصوں میں دو مختلف صفحات پر نظر آیا۔ ایک جگہ اس کے ابتدائی چودہ[1] اشعار جو مطلع ذیل

[1] نسخۂ مطبوعہ میں اس حصہ کے آخر دو دعائیہ اشعار موجود نہیں ہیں۔

تبارک اللہ ازان آسمان شتاب کرنگ کہ نعل آئینہ رنگش ندید زنگ درنگ

سے شروع ہو کر ذیل کے دعائیہ شعر پر ختم ہوتے ہیں

شگفتہ باد بہ بوئے گل بہار نشاط حسود جاہ تو چون غنچہ باد بادلِ تنگ

اور دوسری جگہ اس مطبوعہ قصیدہ کے بقیہ ۲۶ اشعار پائے گئے جن کے آخر میں بطور مطلع ثانی اس قصیدہ کا پہلا مطلع بھی آخری شعر کی حیثیت سے نظر آیا۔ اس نسخہ میں اس مطبوعہ قصیدے کے دونوں حصوں کے الگ الگ تحریر ہونے سے جہاں ان کے دو مختلف قصیدوں کے حصہ ہونے کے خیال کو تقویت پہونچتی ہے وہیں دوسرے مطلع سے شروع ہونے والے حصہ کے اختتام کے بعد مطلع اول کی موجودگی اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ قصیدہ کا وہ حصہ جو مطلع دوم سے شروع ہوتا ہے قصیدہ کا ابتدائی حصہ ہے اور مطلع اول سے شروع ہونے والا حصہ اس کا آخری حصہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کے بغور مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ ان بارہ (۱۲) یا چودہ (۱۴) اشعار سے پہلے یقیناً ایسے کچھ اشعار ہوں گے جو مطلع ثانی کے بعد کے اشعار میں سے آخری شعر کو ان بارہ (۱۲) اشعار کے ابتدائی شعر یعنی مطلع

تبارک اللہ ازاں آسمان شتاب کرنگ کہ نعل آئینہ رنگش ندید زنگ درنگ

سے مربوط کرتے ہوں لیکن ایسے اشعار کسی بھی نسخہ میں نہیں ملتے۔

جہاں تک اس قصیدہ کے ممدوح کا تعلق ہے نسخۂ تہران اور نسخۂ نولکشور دونوں کے عنوانات سے وہ حضرت علیؓ کی منقبت میں معلوم ہوتا ہے، لیکن کسی بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ میں قصیدہ کے متن سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا، خوش قسمتی سے اس مسئلہ کو محمد شفیع سنبھلی نے اپنی شرح قصائد عرفی "کارنامۂ فیض" میں حل کر دیا اور اس قصیدہ کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے حسب ذیل شعر

بلی چگونہ بود زنگ دار آئینہ　　کہ صیقلی کنندش رائے شاہ یا فرہنگ

کے بعد مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر کیا ہے، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ (یا اس کا وہ حصہ جو مطلع ثانی کے بعد ہے) رسول اکرمؐ کی نعت میں ہو نہ کہ حضرت علیؓ کی منقبت میں

محمد عربی آنکہ آورند خراج　　شہان روم و خراسان و چین و ہند و فرنگ

یہ بات صاف ہو جانے کے بعد کہ اس قصیدہ کے دوسرے مطلع کے بعد کے اشعار نعت رسول میں ہیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر پہلے مطلع سے شروع ہونے والے چودہ (۱۴) اشعار اسی قصیدہ کے آخری اشعار ہیں، تو وہ براق کی تعریف میں ہونگے لیکن اس حصہ کے آخری دو اشعار جو صرف علی گڑھ کے مخطوطہ کلیات عرفی میں ملتے ہیں، اس خیال کی تردید کرتے ہیں، اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ ممدوح کوئی ایسی ہستی ہے جو عرفی کے زمانہ میں موجود تھی اور جس کا دنیاوی جاہ و جلال ایسا تھا جس پر لوگ حسد کر سکتے تھے، یہ دونوں اشعار درج ذیل ہیں۔

ہمیشہ تا بود از اقتضائے لیل و نہار　　بجار باغ عناصر گل اہل صد رنگ

شگفتہ باد بدیت گل بہار نشاط　　حسود جاہ تو چون غنچہ باد با دل تنگ

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں راقم الحروف کو یہ یقین ہے کہ مذکورہ قصیدہ ایک مکمل قصیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہی زمین میں کہے گئے دو مختلف نامکمل قصیدوں کے اشعار کا مجموعہ ہے، جس کے ابتدائی چودہ (۱۴) اشعار کسی امیر یا بادشاہ کے گھوڑے کی تعریف میں نظم کیے گیے ہیں (اور یہی اشعار اس نامکمل قصیدہ کی تشبیب ہیں) اور بقیہ چھبیس (۲۶) اشعار جو مطلع ثانی سے شروع ہوتے ہیں نعت رسول میں کہے گیے ایک دوسرے ہی غیر مکمل قصیدہ کا جزو ہے۔

مختلف نسخوں کے تقابل سے مطبوعہ نسخوں میں اس قصیدہ کے تحت شائع ہونے والے اشعار میں کچھ اغلاط اور لفظی اختلافات بھی سامنے آئے۔ ان کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ان دونوں

غیر مکمل قصیدوں کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قصیدہ اوّل

منم کہ شستہ[1] ام از لوح مدعا نیرنگ[2]　　نہ تشنگی کشم آبم نہ آرزو چشم رنگ

شکستہ کشتی و لی ساحل است بحر کجاست　　شناوری کہ تواند گریختن ز نہنگ

چہ سود دشمنم با سپہر مینائی　　نہ زور در خم بازو نہ در فلاخن سنگ

بزیر سایہ طوبیٰ غنودہ ام یعنی　　نہ در عنان شتابم نہ در رکاب درنگ

بچار بالش تسلیم تکیہ کردہ مدام　　تبسمی نہ بصلح و کنایتی نہ بجنگ

صنم بجیب نہ دخیزم از در اسلام　　ردا بدوش نہ دبگذرم ز شہر فرنگ

بکعبہ نغمۂ ناقوسم آورد بہ سماع　　نماز شب[3] بکنم گر قضا شود ارژنگ

اگر سرود صمد جوشد از لبم در دیر　　نفس ہمی شکنم در گلوے سینہ تنگ

برنگ بونیم آلودہ زان سبب دورم　　ز گلفروشی ایام و شکستہ رنگی ننگ

نہ در مذاق من از جوش عافیت لذت　　نہ بر جبین من از نیش محنتی آژنگ

ز ذوق لب نگزم گر بشہد غوطہ زنم　　بریزم آب دہاں گر فرو دہم شرنگ

ہجوم دعوی من در تساوی اضداد　　کنا سیت کہ آئینہ ام ندارد زنگ

بلی چگونہ بود زنگ دار آئینہ　　کہ صیقلی کنندش رائے شاہ با فرہنگ

محمد عربی آنکہ آورند خراج　　شہان روم و خراسان و چین و ہند و فرنگ

شہی کہ صیقل رائے ہدایت افروزش　　چنان زدودہ ز آئینہ کدورت زنگ

---

[1] ن شیشہ / شستہ　[2] ن بیرنگ / نیرنگ　[3] ن نماز بت / نماز شب

کہ پردہ شاہد ایمان بجز لحس بصر
سیاہی از شکن زلف بتان فرنگ

مطرفشان شود از ابر لطف او بر کوہ
شود چو آب ور آید بزیر صفحہ سنگ

آپاشی کہ بہ دل گرمی حمایت تو
برد بیضہ شاہین نشستہ مادہ کلنگ

بجوہ جاہ تو جوید زمانہ نسبت ازان
ز نور و سایہ کند جلوہ در لباس پلنگ

اگر دہی بہ ضمیرت عنان نظم امور[1]
رود بہ صنعت روشنگری طبیعت زنگ

بعون عینک رائے تو اعمی فطری
کند مشاہدہ از نغمہ صورت آہنگ

نگاشتند برائے نمونہ صورت دہر
جہان جاہ ترا می زدند چون نیرنگ[2]

محیط عام جاہ تو دارد آن وسعت
کہ بر شکوہ اہلیش ہست دایرہ تنگ

زہی محال چو حفظت بہ بحر خیمہ زند
کہ بعد ازین شکنند زورقی ز آب نہنگ

اگر نہ طبع تو محمل طراز بودی کی
عروس علم نشستی بہودج فرہنگ

دل سیاہ عدوی ترا اگر گویند
کہ نسبتی بہ سپہرش بود بہیبت و رنگ

بدون زدند عناصر عصیر وش ز فلک
ز بسکہ دایرۂ آسمان بگردد تنگ

فروغ شعلۂ قہرت چو در رحم افتد
بہ چشمہ زار بزاید سمندر از خرچنگ

نمود و تو بکف آرم عنان معنی را
کہ ہیبت تو رباید ز روی اعدا رنگ

قصیدۂ دوم

تبارک اللہ ازان آسمان شتاب کمیت
کہ نعل آئینہ رنگش[3] ندیدہ زنگ[4] درنگ

درین ہوس کہ رود ہمعنان مگر نفسی
شبانہ روز زند شاطر سپہر شلنگ

۱؎ امور/ امور ۲؎ ن نیرنگ/ بیرنگ ۳؎ ن رویش/ رنگش ۴؎ ن روی/ رنگ/ زنگ

اگر بہ ساحت میدان او در آید غم
دگر کشادہ شود از ہجوم غم دل تنگ

سبک روی کہ چنان بر دو چو زخمہ تار[1]
کہ نغمہ لب نکشاید بہ عرصۂ آہنگ

جہندہ ای کہ بگاہ جہندگی شاید
کہ جوہر تنش آید برون ز جامۂ رنگ[2]

اگر کند مثل طی[3] ساحت اضداد
ز طبع شہد بگامی[4] رود بطبع شرنگ

دگر کنند ازوے نسبت درنگ بسہو
شتاب فہم شود بعد ازین ز لفظ درنگ

زمانہ گفت زہی آسمان قوس قزح
بزیر سینۂ او چون بدید رنگیں تنگ

ستارہ گفت کہ اینک سپہر و چشمۂ مہر
نشانۂ سم او دید چون بروی نہنگ

حساب طول امل[5] در فضاے میدانش
چو عرصۂ ابد است و شمارۂ فرسنگ

خرد دعاے ایں افکار گفت و منکر شد
ز بہر آن کہ نہ راضی بود ز ننگ بہ ننگ

منش مدارج افکار گفتم و خجلم
ازان کہ دارد ازین نام ہم بغایت ننگ

ہمیشہ تا بود از اقتضاے لیل و نہار
بہ چار باغ عناصر گل امل صد رنگ

شگفتہ باد بہ دیت گل بہار نشاط
حسود جاہ تو چون غنچہ باد با دل تنگ

۱؎ ن زخمہ ساز/ بہ زخمہ تار/ چو زخمہ بتار ۲؎ ن تنگ/ رنگ۔ ۳؎ ن طی مساحت/ طی ساحت ۴؎ ن بکامی/ بگامی ۵؎ ن عمل/ امل

شاہ صاحب کی وفات پر تعزیتی تار اور خطوط

ہندوستان کے ہر حصہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین اور اڈیٹر معارف کے انتقال پر ملال پر اظہار غم کیا جارہا ہے، برابر تار، خطوط اور تعزیتی تجویزیں موصول ہورہی ہیں جن کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے، کارکنان دار المصنفین ایسے تمام لوگوں اور اداروں کے بیحد ممنون ہیں، جو اس حادثہ جانکاہ پر اس کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ص - ع

ذیل میں ان میں سے کچھ تار، خطوط اور تعزیتی تجاویز درج کی جاتی ہیں،

تار

حسب ذیل حضرات کے تعزیتی تار ابتک موصول ہوئے ہیں،

(۱) قائم مقام مہتمم دار العلوم دیوبند، (۲) مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، (۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ و نامزد سفیر شام (۴) مولانا سعید احمد اکبر آبادی اڈیٹر برہان دہلی، (۵) جناب عبید الرحمن خان صاحب شروانی علی گڈھ، (۶) مولانا حافظ عمران خان صاحب ندوی ناظم دار العلوم تاج المساجد بھوپال (۷) مولانا اسرار الحق صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند دہلی، (۸) مولانا محمد اویس ندوی نگرامی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ، (۹) جناب سید انصاری صاحب سابق پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ دہلی، (۱۰) جناب ابرار مصطفےٰ صاحب صدر شعبۂ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

علماء کے خطوط

۱۶ دسمبر ۱۹۷۴ء تکیہ کلاں، رائے بریلی،

برادر مکرم و محترم زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حادثہ جانکاہ پر آپ کو کچھ لکھنے کی ہمت ہے نہ طاقت نہ زبان و قلم ساتھ دیتے ہیں آپ پر اس وقت جو کیفیت طاری ہوگی، اس کے پیش نظر کچھ لکھنا بھی تکلیف دیتا ہے، پھر ایک غم زدہ دوسرے غم زدہ سے کیا تعزیت کرے، البتہ آپ سے جلد سے جلد ملنے کی خواہش بڑھ گئی ہے، کہ اپنی کہہ کر اور آپ کی سن کر، دل کا بوجھ ہلکا کیا جائے، معلوم نہیں، آپ نے کیا سوچا ہے، اور کیا پروگرام بنایا ہے، میں اور مولانا عمران خان صاحب دونوں منتظر ہیں، واقعہ اس طرح گذر گیا جیسے کوئی خواب دیکھا ہو، اس وقت کسی طرح یہ چند ٹوٹے پھوٹے فقرے لکھ رہا ہوں آپ کیلئے صبر و سکون کی دعا کر رہا ہوں، کہ حادثہ سخت ہے، اور آپ بڑی حساس طبیعت اور درد مند دل رکھتے ہیں۔

والسلام

ابو الحسن علی ندوی،

منو ضلع اعظم گڈھ

۵ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں سفر میں تھا، واپسی پر پہلی اندوہ ناک خبر یہ سنی کہ شاہ صاحب کا جمعہ کو انتقال ہوگیا یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا، لیکن اخبار منگوا کر پڑھا تو دل پر ایک بجلی سی گری، اور زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا، شاہ صاحب سے اخلاص و مودت کا رشتہ آپ کے دار المصنفین آنے سے پیشتر سے قائم تھا، کھانے کی اجتماعی مجلس جب شبلی منزل میں ختم ہوگئی، تو سید صاحب

مرحوم کی عدم موجودگی میں جب میرا جانا ہوتا تھا، تو شاہ صاحب کے ساتھ کھایا کرتا تھا، مرحوم بہت نیک دل، پاکیزہ سیرت، اور علم دوست تھے، میرے دل میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی حق تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، دارالمصنفین میں ان کی جگہ مشکل سے پر ہوگی، میں اگر مئو میں ہوتا اور خبر پاتا تو نماز جنازہ میں ضرور شریک ہوتا، ان کی وفات کے بعد صدمہ کے علاوہ مجھے اس کا بھی قلق ہے۔

الھمکم اللہ الصبر و اعظم لکم الاجر و غفر لمیتکم

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

مدرسہ بند تھا کھلنے کے بعد مرحوم کی روح کے لیے ایصال ثواب کی سعادت بھی حاصل کی جائیگی۔

۱۴؍دسمبر ۱۹۷۴ء۔ لکھنؤ

محترمی و مکرمی جناب مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب احسن اللہ الیکم

سلام و رحمت

پرسوں شنبہ کے دن ۱۲ بجے کے بعد "قومی آواز" کے اڈیٹر عشرت صاحب نے ٹیلیفون کیا، اور شاہ صاحب کے سانحہ کی اطلاع دی، چونکہ بیماری وغیرہ کی کوئی خبر نہیں سنی تھی، اس لیے میں نے ان سے کہا کیا خبر قابل اعتبار ہے؟ انھوں نے بتایا کہ دہلی سے ابھی آنے والے ایک صاحب نے بتلایا ہے، خبر مصدق ہے، یقین کر لینا پڑا، تفصیل کوئی معلوم نہ تھی،

کل شام دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے ایک عزیز نے حادثہ کی وہ تفصیل بتلائی جو ان کو معلوم ہوئی تھی، واقعہ یہ ہے، کہ شاہ صاحب کے اسطرح جانے پر بڑا ہی رشک آیا، اس موت پر ہزار زندگیاں قربان، بظاہر تو اعلیٰ درجہ کی مقبولیت کی نشانی ہے، پچھلے سال ان دنوں

مکہ معظمہ میں اور پھر مدینہ طیبہ میں ساتھ رہا، رات کا کھانا ہم سب شیخ الحدیث کے دسترخوان پر کھاتے تھے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلسۂ تعزیت کی بات یاد ہے، آپ کے ضعف قلب اور شدت تاثر کا اندازہ ہے، آپ پر جو گذری ہو کم ہے، معلوم ہوا کہ آپ کا یہ حال ہوا کہ دہلی آنے کے قابل بھی نہ رہے، اور نہ آسکے، اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے، اور آپ سب حضرات کو اور ملت و امت کو ان کا قائم مقام دے۔

ولیس علی اللہ بعزیز۔

حضرت سید صاحبؒ کے بعد بالکل امید نہ تھی کہ دارالمصنفین کا کام اسی طرح جاری رہے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ دونوں حضرات سے کام لے لیا، وہی قادر مطلق اب بھی ہے، اس کی رحمت سے پوری دستگیری کی امید ہے۔

آج کل تعزیت ناموں کی کثرت ہوگی، میرے اس عریضہ کے جواب بلکہ رسید کی بھی ضرورت نہیں، خدا کرے آپ کو یہ مل جائے۔ اور بس

والسلام۔ محمد منظور نعمانی　　　　ندوۃ المصنفین ۔ دہلی،

۱۹؍دسمبر ۱۹۷۴ء

مخلصم و محترم جناب سید صباح الدین صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

۱۴؍دسمبر کی شب بھی کتنی ہولناک تھی کہ بیک وقت دو مخلص اور لائق ترین دوستوں کی دائمی جدائی کی خبر لائی، بیرسٹر نورالدین احمد تو ہمیں آنکھوں کے سامنے رخصت ہوئے، اور شاہ معین الدین صاحب مرحوم کی خبر ریڈیو سے سنی، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان

دونوں صدموں سے دل و دماغ ہل گئے۔

اس وقت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایک خصوصیت آنکھوں میں گھوم رہی ہے، متین، سنجیدہ، باوقار، شگفتہ، متواضع، سادہ مزاج، دل غبار اور ہر قسم کی تمکنت سے پاک ایسی مٹی سے بنے تھے جس میں غبار کا نام نہیں تھا، مستند عالم دین اور اعلیٰ درجے کے مصنف، بلند پایہ مورخ اسلام، ان کی کن کن خوبیوں اور کمالات کو یاد کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے مرحوم اپنے رنگ میں منفرد تھے، بارہا ارادہ ہوا کہ ان کی زندگی میں دو چار روز شبلی منزل میں بسر ہوں اور لطف صحبت اٹھایا جائے، کون کہہ سکتا تھا کہ اس قدر جلد اور اتنی عجلت میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہم لوگوں کو تو ان کی علالت کا بھی علم نہ ہوا، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مرحوم نے اور آپ نے جس محنت و کاوش اور جس قابلیت سے دار المصنفین کو زندہ رکھا اس کا اعتراف نہ کرنا صریح ناانصافی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور آپ اس صدمہ کو برداشت کر سکیں، مرحوم کے صاحبزادے کہاں ہیں، موقع ملے تو ان کا پتہ تحریر فرمائیں، روحوں کی مناسبت بھی عجیب چیز ہوتی ہے، ہماری روحوں میں یہ مناسبت موجود تھی، رہ رہ کر آپ کی تنہائی کا خیال آرہا ہے، اللہ تعالیٰ صبر و استقامت کی دولت سے نوازے، تار مل گیا ہوگا، کارکنان ندوۃ المصنفین کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں، میں نے از راہ تعلق خاص مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے اور ایصال ثواب بھی

فقط۔ والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ
نئی دہلی۔ ۱۰ر دسمبر ۷۴ء

محب محترم و مکرم
السلام علیکم

میں ۲۸ر کو ہوائی جہاز سے حیدرآباد گیا تھا، وہاں سے واپس پہنچتے ہی شاہ صاحب کی خبر وفات

اچانک سنی، تو قلب و دماغ پر بجلی گر پڑی، اس حادثۂ عظیمہ پر آپ سے زیادہ تعزیت کا حقدار کون ہو سکتا ہے، اس لیے کل مفتی صاحب اور میں آپ کے نام دفتر برہان کی طرف سے ایک ٹیلیگرام بھیج چکے ہیں، اور میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔

بھائی! شاہ صاحب (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم لرز رہا ہے) کی وفات حسرت آیات اسلامیات اور علم و ادب کا اتنا بڑا حادثہ ہے، کہ اسکی تلافی مشکل ہے، دار المصنفین کی محفل سونی ہو گئی، معارف کا چراغ گل ہو گیا، اور شبلی و سید کے چمن پر خزاں آگئی، آپ کے عمر بھر کے رفیق، ہمدم و دمساز تھے، اب آپ تنہا رہ گئے، میں اندازہ کر سکتا ہوں، کہ اس وقت آپ کی حالت کیا ہوگی، لیکن یقین کیجیے میرے لیے بھی مرحوم کی ناگہانی وفات، ایک حقیقی بھائی کی موت ہے، جب سے یہ خبر سنی ہے، طبیعت بے قرار اور بے چین ہے، اور آنکھوں میں مرحوم ہی کی تصویر بسی ہوئی ہے، ہائے کن کن خوبیوں اور اوصاف و کمالات کے انسان تھے، صباح الدین صاحب! مجھکو ان سے والہانہ محبت تھی اور ان کو مجھ سے آپ نے اگر معارف کا کوئی نمبر ان کی یادگار میں نکالا تو میں اس میں ضرور شریک ہوں گا، اسوقت شاید اپنے جذبات قلم بند کر سکوں، اسوقت سمجھ میں نہیں آتا، کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں، برہان میں ایک نوٹ لکھ کر بھیج چکا ہوں، یہ تصور کر کے کلیجہ شق ہوتا ہے، کہ اب دار المصنفین اور معارف کی ساری ذمہ داریاں تنہا آپ کے سر پر آپڑیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شاہ صاحب مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور آپ کو صبر و استقامت کی توفیق عطا ہو، (آمین ثم آمین) اس پر اکتفا کرتا ہوں، باقی پھر،

والسلام
آپ کا شریک غم
سعید احمد اکبرآبادی

جماعت اسلامی ہند

دہلی

شاہ معین الدین صاحب مرحوم کے انتقال پُر ملال سے جو صدمہ آپ کو پہنچا ہوگا، اس کا بیان کرنا مشکل ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ کے عمر بھر کے رفیق تھے، موصوف نے جو خدمات انجام دیں ان کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے امید رکھنی چاہئے، کہ وہ ان کو فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا،

اللہ تعالےٰ آپ کو اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، براہ کرم ہم لوگوں کی طرف سے مرحوم کے ورثاء کی خدمت میں سلام اور تعزیت پیش فرمادیں۔

والسلام محمد یوسف

برادر محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

محترمی مولانا شاہ معین الدین صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین!

براہ کرم ہم سب اہالی مرکز کی طرف سے موصوف کے متعلقین کی خدمت میں سلام اور تعزیت کا پیغام پہنچائیے، اللہ تعالےٰ ان سب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین!

اور ہم سب کو اس منزل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

والسّلام قائم مقام قیم جماعت

پھلواری شریف۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی جناب صباح الدین صاحب زید مکارمکم،

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ پٹنہ کے ایک مقامی اخبار میں شاہ معین الدین احمد صاحب کے بارے میں

ایسی خبر شائع ہوئی ہے، جس کو یقین کرنے کو دل کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا ہے، اور موصوف کو اصطلاحاً مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرا رہا ہے۔

آپ سے دریافت کر رہا ہوں، کہ کیا یہ خبر صحیح ہے، چونکہ اس سے پہلے موصوف کی علالت یا کسی طرح کی ناسازی طبیعت کی اطلاع نہیں تھی، اور کسی اور اخبار سے اس کی تصدیق بھی نہ ہوسکی، اس لیے مزید تشویش و تعلق ہے۔

عرض ہے کہ آپ تفصیلاً مطلع فرماکر مطمئن کریں۔

کیا حضرت سلیمانؒ کی قائم کردہ بزم کا صدر، جس پر ہم سب لوگوں کو فخر و ناز تھا، واقعۃً ہم لوگوں سے جدا ہوگیا؟ اگر ایسا ہے تو یا حسرۃً علی العباد، نہایت بے چینی و اضطراب میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں، جلد حالات سے مطلع فرمائیے۔

والسلام

عاجز عون احمد قادری

خانقاہ رحمانی مونگیر

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم بندہ سلام مسنون

مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کے حادثۂ ارتحال کی خبر سے بڑا صدمہ پہنچا، انا للہ وانا الیہ راجعون، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، ادبی اور تاریخی کارنامے فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں، اور انکی تحریروں کا توازن ہمیشہ یادگار رہے گا، کم از کم دار المصنفین کو ان کا بدل ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔

حق تعالےٰ حضرت مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور انکے مراتب بلند کرے اور ہم سب لوگوں کو اس غم پر صبر کی توفیق بخشے آمین!

والسّلام منت اللہ

۱۵ دسمبر ۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدومی مخلصم مرم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

حادثہ فاجعہ کی اطلاع اخبار کے ذریعہ ہوئی، طبیعت بے چین ہوگئی، بڑی دیر تک سکتہ کی کیفیت رہی، بس اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے شاہ صاحب کی ملی خدمات قبول فرمائے، اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے،

۱۵ اردسمبر کا احتساب چھپ چکا تھا، انشاء اللہ یکم جنوری کے احتساب میں نوٹ آئے گا، اب ساری ذمہ داری آپکے کندھوں پر آگئی ہے، امید ہے کہ آپ معارف اور دار المصنفین کی روایات کو قائم رکھیں گے۔ آپ کو، دار المصنفین کے احباب کو، اور شاہ صاحب کے پس ماندگان کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

مناسب ہو تو وفات کے وقت کے حالات سے مطلع فرمائیں،

محمد تقی امینی علی گڑھ

جامعہ نگر دہلی

برادر مکرم السلام علیکم

اچانک رات کو اردو خبروں میں سنائی پڑا کہ شبلی اکاڈمی کے ناظم شاہ معین الدین احمد ندوی کا کل انتقال ہوگیا، لیکن یقین نہیں آیا۔ یہی خیال رہا کہ کانوں کو دھوکا ہوا، اسوقت حکیم اسحاق صاحب کے بھائی انعام صاحب سے معلوم کیا، کہ کیا بیماری کی اطلاع تھی؟ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، صبح کی خبروں میں کوئی ذکر نہیں تھا، دو دلی کے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کو اطلاع ہے، مگر رات کی اس مختصر خبر کے سوا اب تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا، اتوار کی وجہ سے جامعہ نگر کا ڈاکخانہ بند ہے،

پر کارڈ بھی دوشنبہ کو نکلے گا، اور آپ تک کہیں بدھ جمعرات تک پہنچے گا، الجمعیۃ میں صرف ریڈیو کی مختصر خبر ہے، دل ابتک یہی کہتا ہے کہ خبر غلط ہے، اور شاہ صاحب بخیر و عافیت دار المصنفین میں ہیں لیکن پھر بھی فکر ہے، براہ کرم حالات سے مطلع فرمائیے،

نومبر میں لکھنؤ میں دو تین دن ساتھ رہا، کسی قسم کی صحت کی خرابی نہیں تھی، بالکل اچھے تھے، آخر یہ یکایک کیا ہوگیا، اگر خدا نخواستہ یہ سانحہ ہوگیا ہے، تو بڑی ہی اندوہ ناک بات ہے اللہ تعالےٰ رحم فرمائے، وہ تنہا تھے اٹھے چلے گئے، اولاد بھی اپنے پیروں پر ہے، لیکن دار المصنفین کا کیا ہوگا آپ بالکل تنہا ہوگئے، ہرچند کہ سارا زیادہ کام آپ کرتے تھے لیکن شاہ صاحب کی تائید ہمہ وقت آپ کے ساتھ تھی، اور ان کی ذات آپ کے لیے بڑا سہارا تھی، ان کا دل سفر و حضر ہر جگہ آپ کے ساتھ رہتا تھا، اب ایسا خلوص اور ایسی محبت آپ کو کہاں ملے گی، اور دل وجان سے آپ کی ایسی خیر خواہی کون کرے گا، ان کی مرنجاں مرنج ذات کہاں نصیب ہوگی، آپکے مغموم دل کو کون تسکین دے گا، آپ کے تھکے ہوئے بازوؤں کے لیے قوت کدھر سے آئے گی، اور طبیعت کی افسردگی کو کس کی نشاط افروز باتیں دور کریں گی، انھوں نے تو شہر خموشاں پسند کرلیا، اور آپ کو زندگی کے میدان میں تنہا چھوڑ گئے، حالات پیچیدہ، مسائل مشکل، اور وقت نازک ہے، اللہ تعالےٰ آپ کی مدد فرمائے، اور دار المصنفین کی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو خیر و خوبی کے ساتھ ساحل مراد تک پہنچائے، بیدہ الخیر وھو علی کل شئی قدیر، شاہ صاحب تو جنتی تھے ہی اللہ ان کے مراتب بلند فرمائے، اور مقربین کی صف میں شامل کرے۔ فقط

آپ کا شریک غم

عبد السلام قدوائی

دار العلوم دیوبند۔ ضلع سہارنپور
۱۶ اردسمبر ۷۴ء

جناب محترم سلام مسنون، اخبار الجمعیۃ میں قبلہ شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی اطلاع

بڑی تکلیف دہ ہوئی، وہ کاروان علم و ادب کے آخری مسافروں میں تھے، اور شبلی، سید سلیمان مرحومین کے جانشین تھے، میں اپنی زندگی میں غائبانہ طور پر حد درجہ سید صاحب مرحوم۔ مولانا عبد السلام ندوی سے متاثر تھا، اتنا ہی شاہ صاحب سے، حق تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں، دار المصنفین کو ان کا بدل میسر آوے۔

معارف میں ان کے حالات زندگی، ان کی تصانیف کا ذکر تفصیلی طور پر آنا چاہیے، ان کے متعلقین تک براہ کرم میرا پیغام تعزیت پہنچانے کی تکلیف فرمائیں۔ سید ازہر شاہ

کتاب گھر دہلی محترمی سید صباح الدین صاحب السلام علیکم

آہ تعزیت کس سے کروں، کس کے سامنے درد دل بیان کر کے ہلکا ہوں، آج دوہرے صدمہ سے دوچار ہوں، شب ہی میں پیارے دوست بیرسٹر نور الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ خدا دونوں کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور ہم سب کو صبر عطا کرے۔ سجاد

۱۵ دسمبر ۷۴ء غریب خانہ ۔ ۱۳ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال،

محب مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابھی ابھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا تار ملا انا للہ و انا الیہ راجعون حادثہ سخت ہے ایک عظیم مصنف اور ادیب ہی رخصت نہ ہوا، بلکہ ہماری ندوی برادری کا ایک عظیم الشان ستون گر گیا، دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا، تعزیت کیا کروں اور کس سے،

گلہ جدائی کا کس کس کی ہم کریں اے داغ
کہ ہونے والے ہیں ہم عنقریب سب سے جدا

یہ پتہ نہ چلا کہ تدفین اعظم گڈھ میں ہوئی یا دہلی میں،
آپ کا تار ملتے ہی ایک مفصل ایکسپریس تار بھی دیا، امید ہے کہ مل چکا ہوگا،

(حافظ مولانا) عمران خاں ندوی،

علی گڑھ

مکرمی و معظمی جناب سید صاحب زاد عنایتکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا پوسٹ کارڈ، ۱۸ دسمبر کا آج صادر ہوا، آپ کی پریشانی کا بہت افسوس ہوا، کام اب آپ کو سنبھالنا ہے، یہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اور دوسروں کو سکھانا ہے، تاکہ وہ آپ کی مدد کریں، اور آیندہ جانشین ہو سکیں، اسلاف نے اور خود آپ نے اس بوجھ کو اٹھایا، دار المصنفین کو چلایا، بلکہ ترقی دی، عمارتیں بنوائیں، عطیات حاصل کئے، آپ ہمت نہ ہاریں، شاہ صاحب کی جگہ بے شک خالی ہو گئی، اور ساتھ چھوٹ گیا، آپ پر اس کا جس قدر اثر ہو کم ہے، لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ رضینا برضاء اللہ، رضینا بقضاء اللہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے کس وقت جانشینی کے فرائض کس خوش اسلوبی سے انجام دیے، اللہ اکبر، آپ فاضل ہیں، اور مورخ، ہمارے لئے حکم ہے کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

آج ہی منشی اشتیاق علوی کا خط آیا ہے، انھوں نے لکھا ہے، کہ حضرت مولانا علی میاں قبلہ کی بابت معلوم ہوا کہ وہ رائے بریلی میں یہ خبر جانکاہ سنتے ہی سکتہ میں آگئے، اور دو دن کسی سے بات نہیں کی۔

عبید الرحمٰن

مشاہیر ادب کے خطوط

۱۸ دسمبر ۷۴ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مکرمی و محترمی سلام مسنون، کل اخبار سے شاہ معین الدین صاحب کے سانحۂ رحلت کی خبر ملی، کتنی اچانک اور کیسی اندوہ ناک، جس کی طرف خیال بھی نہیں گیا تھا، موت کتنی ہی اٹل کیوں نہ ہو، زندگی اور زندہ رہنے کے بھی کچھ قرائن ہوتے ہیں، جن کا لحاظ ہوتا بھی ہے،

ہم سب مرحوم سے اتنی دور رہ کر اور اتنا کم ملنے کا اتفاق ہونے کے باوجود اس مفارقت پر اتنے بے قرار ہیں، تو آپ کا اور دوسرے وابستگان شبلی منزل اور دار المصنفین کا کیا حال ہوگا جہاں کی فضا میں مرحوم کی دلآویز شخصیت پیوست تھی، وہ ان کی شرافت، شائستگی، تواضع و تکریم اور علم کا وزن و وقار۔

حیات سلیمان کس محبت، افتخار و اعتبار سے بھیجی تھی، اور باوجود چند در چند معذوریوں کے میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا، حالانکہ اس کی صرف جز بندی ہوئی تھی، اوراق کٹے نہ تھے، لیکن مرحوم نے معلوم نہیں کتنی اور کیسی محبت سے بے اختیار ہو کر کتاب جوں کی توں بھیج دی، مجھ پر اس کا اثر ہے، اور اس وقت جبکہ یہ سطریں آپ کو لکھ رہا ہوں، وہ تازہ ہو کر اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا ہے سوچتا ہوں بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی مفارقت سے کتنی حسرت ناک ہو جاتی ہیں، کبھی کبھی ان کی بڑی باتوں کی یاد سے دلفگار تر۔

معارف میں مرحوم کے لکھے ہوئے شذرات وزن اور وقعت میں معارف کے پیشینوں کی یاد تازہ کرتے تھے، حال میں حج کی واپسی پر مرحوم نے جو باتیں جس طرح لکھی ہیں، انکو میں نے خاص طور پر پڑھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ سفر حج کا ذکر ہر شخص ایک ہی انداز سے کرتا ہے، دیکھوں شاہ صاحب کس طرح کرتے ہیں، انھوں نے جو کچھ جس طرح لکھا ہے بڑا سنجیدہ، موثر اور دلنشین تھا، اور مشورے دئے تھے وہ بڑے عملی ضروری اور وقیع تھے، اسے پڑھ کر بہت خوش اور مطمئن ہوا، مرحوم نے میری توقعات سے بہتر لکھا، اور بند رہتے ہیں خانوں سے باہر نکلنے کی مرحوم میں کتنی اچھی صلاحیت تھی، معارف کے شذرات میں مرحوم کی یہ صلاحیت پوری طرح نمایاں رہتی تھی، نازک اور سنگین مسائل پر بڑی منصفی، توازن اور جرأت سے اظہار خیال کرتے تھے،

حیات سلیمان کی تدوین میں مرحوم نے حسب عقیدت، احتیاط اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے وہ دار المصنفین کی دیرینہ گرانقدر روایات کے عین مطابق ہے۔

ایسے غمناک حادثہ پر دیر تک متاثر رہنے اور اسکا تذکرہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں اس دعا پر اکتفا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور مرحوم سے محبت اور انکی عزت کرنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین! یہ بھی دعا مانگتا ہوں کہ خداوند کریم آپ کو اس قابل بنائے، اور رکھے کہ آپ شبلی منزل اور دار المصنفین کی بیش بہا اور گوناگوں خدمات اور روایات کو اپنی شخصیت اور علمی خدمات سے تا دیر تازہ و تابندہ رکھیں اور دار المصنفین کے معیار اور مقصد کو آگے بڑھانے کیلئے ذہین اور مخلص اسکالرس کی جماعت فراہم اور منظم کرنے میں کامیابی عطا فرمائے آمین! دعا ہے آپ خیریت سے ہوں آپ سب کے غم میں شریک۔

مخلص رشید احمد صدیقی

جامعہ نگر نئی دہلی

۱۹ دسمبر ۱۹۷۴ء

سید المحترم السلام علیکم

شاہ معین الدین مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت رنج اور افسوس ہوا، جانتا تو تھا ایک [illegible] مرحوم عرصہ سے علیل رہتے تھے، مگر ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں، وہ ایک اہم اور گراں قدر ادارے کی جان تھے اور خود بھی ایک ادارہ تھے، جس ایثار اور عالی ہمتی کے ساتھ انھوں نے آپ کی مدد سے دار المصنفین کو برسوں چلایا، اور حد درجہ ہمت شکن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ادارے کے کام کو جاری رکھا اسکی جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہے، ان کی جدائی نے گویا آپ کو تنہا چھوڑ کر توڑ دیا ہے، اللہ تعالیٰ انکو جنت میں جگہ دے اور انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے آپ کی صحت و سلامتی کیلئے آپکے مداح اور ادارے کے ہمدرد بہت بدعا رہیں گے خدا آپ کی مدد کرے اور کام کو جاری رکھنے کی ہمت اور وسائل عطا فرمائے، آپکے غم میں شریک

بشیر الحسین زیدی

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۲۰ دسمبر ۱۹۷۴ء

محب مکرم شاہ صاحب قبلہ کے انتقال کی خبر سے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان نہیں کر سکتا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں، حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے،

کیا ہوگا اس کم بخت اردو کا، پرانے بادہ آشام ایک ایک کرکے اٹھتے جاتے ہیں، اور جو نئے ہیں ان کے اندر نہ وہ دل سوزی ہے، اور نہ وہ دیدہ ریزی، علم و فضل کا تو سوال ہی نہیں، بالشتیوں سے کہیں یہ بوجھ اٹھ سکتا ہے؟ بقول خواجہ میر درد، ایک قاتل بس آپ رہ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، مجھے اپنی کوتاہیاں معلوم ہیں، بہت ہی بے علم آدمی ہوں لیکن دار المصنفین اور معارف کے سلسلہ میں جو خدمت بھی آپ سپرد فرمائیں گے اسے بخوشی بجالاؤں گا۔

شاہ صاحب مرحوم بڑی ہمت افزائی فرماتے تھے، ۲۴/ اپریل ۷۴ء کے خط میں لکھتے ہیں "بلا تصنع لکھتا ہوں کہ آپ کی تحریر پر رشک آتا ہے، کاش ایسی چند سطریں لکھ سکتا"۔ ان کا خیال آتا ہے تو دل لوٹنے لگتا ہے۔ ع بناشد ہرش از جانم فراموش۔

آپ کا شریک غم

خواجہ احمد فاروقی

نفیس منزل بدرباغ
علی گڑھ

۱۰/ دسمبر ۷۴ء

مجی صباح الدین صاحب تسلیم

ہمارے دوست شاہ معین الدین صاحب ندوی کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، شاہ صاحب سے دیرینہ مراسم تھے، ان کی علمی و ادبی صلاحیت کے علاوہ ان کی مخلصانہ روش، وہ رہ کر یاد آتی ہے، اور ان کی وضعداری، ملاقات آخری دفعہ شاید ۱۹۶۹ء میں دہلی میں غالب کے اجتماع کے سلسلہ میں ہوئی تھی، انجمن کے جلسوں میں کئی سال سے وہ نہ آسکے تھے، یہ بھی سنا تھا، کہ ادھر صحت اچھی نہیں رہتی تھی، اب ادارے کی ساری ذمہ داریاں آپ ہی پر ہیں، خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، دار المصنفین کا کام تو بہرحال کسی طرح چلنا ہی چاہئے، کچھ کام نوجوانوں پر ڈال دیجئے، اہم کاموں کی نگرانی ہی اپنے ذمہ رکھیے، حالات صبر آزما ہیں، مگر آپ جیسے مخلص اور غیر معمولی صلاحیتوں والوں کیلئے راستے نکل ہی آتے ہیں،

مخلص

آل احمد سرور

نئی دہلی

۱۹/ دسمبر ۱۹۷۴ء

قبلہ! السلام علیکم

خط ملا۔ اسی کے ساتھ یہ اندوہناک اطلاع بھی ملی کہ شاہ صاحب مرحوم نے ہمیں داغ مفارقت دیا، میں ان سے پہلی بار ۱۹۳۹ء میں ملا تھا، پینتیس ۳۵ برس بیت گئے، لیکن ان کی وضعداری، محبت اور ادب دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا، عظمت علم کے باوجود فروتنی، علم کی گہرائی اور وسعت کے باوجود شہرت سے گریز اور گوشہ نشینی، میری آزادہ روی اور آزاد گفتاری کے باوجود ان کا بے پایاں خلوص، ان کا دل نشین صوفیانہ انداز زندگی، ان کی ناقابل تسخیر مسکراہٹ، ان کا تبحر، ان کی شگفتہ نثر، ادب و شعر سے ان کا گہرا لگاؤ، خردوں سے برابر والوں جیسا برتاؤ، شبلی و سلیمان ہی سے نہیں، سہیل و عبد السلام ہی سے نہیں بلکہ اعظم گڈھ اور پورب سے وابستگی، ان کی وسیع النظری اور وسعت قلب کے ساتھ ان کی طبعی شگفتگی دردولوازی کا ثبوت ہیں، وہ یقیناً زاہد تھے لیکن ان میں زاہدانہ یبوست نہ تھی، وہ عالم تھے لیکن ان کو غرور علم نہ تھا، وہ ادیب تھے لیکن خود کو خادم ادب ہی کہتے اور سمجھتے رہے، وہ ہمارے ثقافتی اور علمی روایات کے امین تھے، ان کے اٹھ جانے سے دار المصنفین کی محفل ہی نہیں بلکہ علم و ادب کی محفل کا اہم گوشہ سنسان ہوگیا، لیکن اپنا اختیار کیا ہے۔ رضاً بقضائہ و تسلیماً لامرہٖ۔ اس عظیم حادثے میں میری جانب سے تمام ارباب دار المصنفین اور مرحوم و مغفور کے متوسلین کو ادائے تعزیت اور تلقین صبر کریں، خدا مرحوم کو اپنے حبیب کے جوار میں جائے عالی مرحمت کریں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شریک غم۔ علی جواد زیدی

۱۶/ دسمبر ۷۴ء

دفتر ماہنامہ شاعر، بمبئی۔

مکرمی صباح الدین عبد الرحمن صاحب سلام مسنون

آپ کو دار المصنفین کے اراکین اور شاہ صاحب مرحوم کے پس ماندگان کو کس دل سے اور

کن الفاظ میں تعزیت نامہ لکھوں، پرسوں سنیچر کی شب میں ایک اجتماع کے اختتام کے بعد محبی سید شہاب الدین دسنوی نے یہ المناک خبر سنائی کہ حضرت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا، وہاں کئی ہزار آدمیوں کی بھیڑ تھی، اور ان گنت لوگ مل جل رہے تھے، لیکن کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہ کر سکا، خود قلب کی تکلیف میں مبتلا ہوں اور مشکل سے اس اجتماع میں گیا تھا، ½ ۱۲ شب کو واپسی ہوئی اور پھر صبح کے ۴ بج گئے کروٹیں بدلتے بدلتے

بڑا سانحہ ہوا ہے، علمی دنیا کا یہ نقصان عظیم ہے، دار المصنفین کا آخری ستون گر گیا، اللہ آپ سب کو اور ان کے پسماندگان و وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے، اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

شاہ صاحب مرحوم سے زندگی میں دو ہی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، یوں لگتا تھا کہ کسی معصوم فرشتہ سے ملا جا رہا ہے، ان کا وہ علمی کام، دار المصنفین کی قیادت، دوستوں اور عزیزوں سے شفقت و محبت کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔

کل اتوار کے روزنامہ انقلاب میں بھی انکے انتقال پر ملال کی اطلاع شائع ہو گئی تھی، تفصیلات سے لاعلم ہوں۔

آپ کا شریک غم اعجاز صدیقی۔ مدیر شاعر

گل مرگ ہوٹل لکھنؤ،

باسمہ

محترمی صباح الدین صاحب سلام مسنون

ابھی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اس اطلاع سے بہت صدمہ ہوا، کہ ہمارے محترم شاہ معین الدین احمد انتقال کر گئے، ان کی تو علالت کی اطلاع بھی ہم لوگوں کو نہیں تھی، غالباً اچانک وفات ہوئی، خدائے بزرگ سے دعا ہے کہ اپنے حبیب کے صدقہ میں انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اور ان کے پسماندگان اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، پروفیسر نذیر احمد صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں اور اس صدمہ میں آپکے برابر کے شریک ہیں، سوگوار مختار الدین احمد و نذیر احمد

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

خطۂ پاک اوچ۔ مرتبہ: جناب مسعود حسن شہاب صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۴، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۱۵ پتہ اردو اکیڈمی بھاول پور۔

اوچ ریاست بہاولپور (مغربی پاکستان) کا قدیم متبرک مقام ہے، اس کتاب میں اسکی مفصل تاریخ اور گذشتہ شوکت و عظمت کے ساتھ یہاں کے علماء و صوفیہ، آثار قدیمہ اور نوادر وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، یہ ۹ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے اوچ کی قدامت، اس کے پرانے ناموں اور محل وقوع کا ذکر کر کے اسکی اہمیت و عظمت دکھائی گئی ہے، مصنف کا خیال ہے کہ پانچ ہزار سال قبل آریوں کی آمد سے بھی پہلے اوچ کی بنیاد پڑ چکی تھی، پھر اسلام سے پہلے اور بعد کے مختلف حکمرانوں کے عہد کے اوچ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں محمد بن قاسم کی فتوحات، عربوں کے تسلط کی روداد اور ان کے دور کے تہذیبی و تمدنی حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، تیسرے، چوتھے اور چھٹے ابواب اس لحاظ سے زیادہ اہم ہیں کہ انمیں اوچ کے ممتاز علما و فضلا و مشائخ کے علاوہ ان صوفیہ کا بھی ذکر ہے، جنھوں نے اوچ کے روحانی مرکز سے فیضیاب ہو کر ہند و بیرون ہند کے مختلف مقامات میں رشد و ہدایت کی قندیلیں روشن کی تھیں۔ علما و صوفیا میں سید صفی الدین گازرونی، قاضی منہاج اور سید حمید الدین ناگوری، بہاء الحق زکریا ملتانی، سید جلال الدین سرخ بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سید صدر الدین راجو قتال اور سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید سکندر بن مسعود ترمذی، شاہ مجیب اللہ صاحب،

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) حسام الدین متقی، مولانا سماء الدین سہروردی، مولانا جمالی سہروردی اور شاہ جمالی لاہوری وغیرہ جیسے اکابر کے تذکرے شامل ہیں، تیسرے باب میں اوچ کے مدرسۂ فیروزیہ اور چوتھے میں تصوف کے وہاں مروج سلاسل وخانوادوں سلسلۂ گاذرونیہ وسہروردیہ اور خانوادۂ بخاریہ وگیلانیہ کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے، ان ابواب میں تصوف کی اصل حقیقت اور صوفیہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا گیا ہے، آخری ابواب میں اوچ کی قدیم عمارتوں، قلمی نوادر، زبان، قوموں، مذہبوں اور اس کے نواح کی بعض اور قدیم بستیوں کا ذکر ہے۔ اوچ کی یہ تاریخ نفود شہنشاہی، سلطنتوں کے عروج وزوال اور تہذیبوں کے ارتقاء وتنزل کی داستان ہونے کی بناء پر مرقع عبرت ہے۔ اس میں اوچ کے علاوہ ملتان، سندھ، بہاولپور اور بعض دوسرے علاقوں کے متعلق بھی مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، لیکن جیسا کہ مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایسی قدیم بستی کے متعلق خاطر خواہ مواد نہ ملنے کی وجہ سے ان کو قدیم منتشر کڑیوں کو جوڑنے کے لیے ظن وتخمین سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ اس لیے بعض واقعات وروایات کی صحت شبہہ سے خالی نہیں معلوم ہوتی۔ کتاب محنت وجستجو سے لکھی گئی اور معلوماتی ہے۔ طرز بیان اور تحریر میں سلاست وشگفتگی ہے، اوچ کی قدیم عماتوں اور نادر مخطوطات کے عکس بھی دئے گئے ہیں۔

جواہر الاصول ۔ (عربی) مرتبہ۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع متوسط کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۱۹۰ قیمت۔ تحریر نہیں۔ پتہ۔ شرف الدین الکتبی واولادہ، ۲۹۳ شارع محمد علی بمبئی۔

یہ رسالہ نویں صدی ہجری کے عالم ابو الفیض محمد بن محمد بن علی فارسی، ہروی کی تصنیف اور اصول حدیث کے قواعد وضوابط پر مشتمل ہے، قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے اپنے ذاتی اور جامع مسجد بمبئی کے کتبخانہ کے قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا متن مفید حواشی وتعلیقات

کے ساتھ پہلی دفعہ شائع کیا ہے، یہ فاتحہ وخاتمہ اور پانچ حصوں پر مشتمل ہے، فاتحہ میں علم اصول حدیث کی ضرورت، اہمیت وفضیلت، بعض مخصوص اصطلاحات اور وضع وتدوین حدیث کی مختصر تاریخ تحریر کی گئی ہے، اور پہلے حصہ میں دو ابواب ہیں، ان کی مختلف فصلوں میں متن کی قسموں مثلاً صحیح اور انواع مسند وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں سند کے مباحث گیارہ میں بیان کیے گئے ہیں، اونہیں راوی کے ضروری اوصاف کا ذکر ہے، تیسرے حصہ میں حدیث کی روایت ونقل کے مختلف طریقے، تحریر وکتابت کے ۱۹ اصول قاعدے اور راوی اور آداب وشرائط بیان کیے گئے ہیں، چوتھا حصہ رجال کے ناموں اور طبقوں کے متعلق ہے، خاتمہ میں محدث کے صدق اور نقد حدیث کے مباحث کے علاوہ بعض نامور محدثین کی فہرست دیگئی ہے، یہ رسالہ ابن صلاح کے مقدمہ اور نووی کی تقریب کا خلاصہ اور متقدمین حاکم، خطیب اور ذہبی وغیرہ کی کتابوں سے ماخوذ ہے، گو اس میں کوئی خاص ندرت وخصوصیت نہ ہو تاہم ترتیب، طرز بیان اور مسائل کے استقصا کے لحاظ سے قابل قدر ہے، اس لئے قاضی صاحب نے اس کو شائع کر کے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، حاشیے میں انھوں نے پیش نظر دونوں نسخوں کے فرق واختلاف کی تصریح اور متن کی مجمل ومبہم عبارتوں اور بحثوں کی توضیح کے لیے اصول کی متداول کتابوں کے حوالے اور ضروری تفصیلات نقل کر دی ہیں، انھوں نے رسالہ کے بعض دوسرے قلمی نسخوں کا بھی ذکر کیا ہے، مگر پتہ نہیں ترتیب واشاعت میں ان سے مدد کیوں نہیں لی،

املا نامہ ۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۸۸ قیمت:۔ عہ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔

اردو رسم الخط کی طرح اردو املا کا مسئلہ بھی عرصہ سے غور وفکر کا موضوع بنا ہوا ہے مگر اس کی جانب بہت کم لوگوں نے اعتنا کیا ہے، پہلے بابائے اردو مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی مرحومین نے اس کی جانب زیادہ توجہ کی تھی اور ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو

کی کمیٹی اصلاح رسم الخط نے املا کے بارے میں سفارشات پیش کی تھیں اب مرکزی حکومت نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے اس نے اور امور کے ساتھ اس جانب بھی دھیان دیا ہے اور اس کے لیے ایک سکہ نفری کمیٹی تشکیل کی ہے . . . .

چنانچہ کمیٹی کے ایک لائق رکن رشید حسن خاں صاحب نے اردو املا کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اور دوسرے لائق رکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات و اصلاحات کو اس کتاب میں مرتب کیا ہے، اس میں اردو املا کے مختلف النوع مسائل کے متعلق سفارشات درج ہیں، مثلاً عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے جو الفاظ اردو میں رائج ہیں انکے املا میں اصل کی پیروی کی جائے یا اردو کے مروج طریقہ کو قائم رکھا جائے، اسی طرح جو الفاظ نون سے لکھے تو جاتے ہیں مگر پڑھے میم سے جاتے ہیں جیسے گنبد وغیرہ انکے بارے میں املا کے کیا قاعدے ہونے چاہئیں یا اسی طرح کے دوسرے مسائل میں املا کو متعین کرنے کیلئے کمیٹی نے جو سفارشات پیش کی ہیں یہ کتاب انکا مجموعہ ہے اسمیں متعدد حروف الف، تنوین، ت، ۃ، ط، ذ، ز، ژ، س، ص، نون، نون غنہ، یائے مختفی، ہائے مخلوط، ہمزہ، کے بنے ہوئے الفاظ اور بعض اعداد وغیرہ کے املا کی بے اعتدالی اور انتشار کو دور کرنے کیلئے اصلاحات بھی تجویز کیگئی ہیں اور لفظوں کے درمیان فصل اور انکو ملا کر لکھنے کے قاعدے، اعراب، علامت اور رموز اوقاف وغیرہ کے بارے میں بھی ہدایتیں دیگئی ہیں، عموماً اس کمیٹی نے انہی سفارشات کو برقرار رکھا ہے جنکو انجمن کی کمیٹی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے پہلے تجویز کیا تھا مگر بعض مقامات پر اختلاف بھی کیا گیا ہے اور بقول ڈاکٹر عبدالعلیم صدر ترقی اردو بورڈ "ان سفارشات میں قدیم علم اور جدید صوتیات دونوں کے تقاضوں کو نظر میں رکھکر بنیادی اصولوں کی وضاحت صاف اور سلیس طور پر کیگئی ہے" شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے مختصر مگر جامع، مفید اور لائق مطالعہ ایک مقدمہ بھی ہے املا میں اصلاح و یکسانیت کی کوشش ایک مفید اور ضروری اقدام ہے اسکا خیر مقدم کیا جانا چاہئے لیکن ایسے ضروری اور اہم مسئلہ میں مزید غور و فکر اور اردو لسانیات کے ماہرین اور ہر طبقہ کے ممتاز اہل علم کے خیالات معلوم کرنا بھی ضروری ہے، ایسی اہم کتاب میں کتابت کی غلطیوں کا پایا جانا افسوسناک ہے، ص ۱۳۰ پر مولا کو ان الفاظ کی فہرست میں دیا گیا ہے جنکے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ پہلے یائے معمولی (الف) لکھے جاتے ہیں مگر اسکے بعد ہی اسکو ان الفاظ میں بھی شامل کر دیا گیا ہے جنکا املا دونوں طرح رائج ہے یعنی مولا اور مولی۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی ایک ہی بات صحیح ہوگی۔

"ض"

جلد ۱۱۵ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۵ء عدد ۲

مضامین